کراچی

آنکھ مچولی

مظلوم بچے نمبر

جون ۱۹۹۶ء

اس شمارے کے ساتھ دعاؤں کے
اسٹیکر ضرور حاصل کیجیے!!

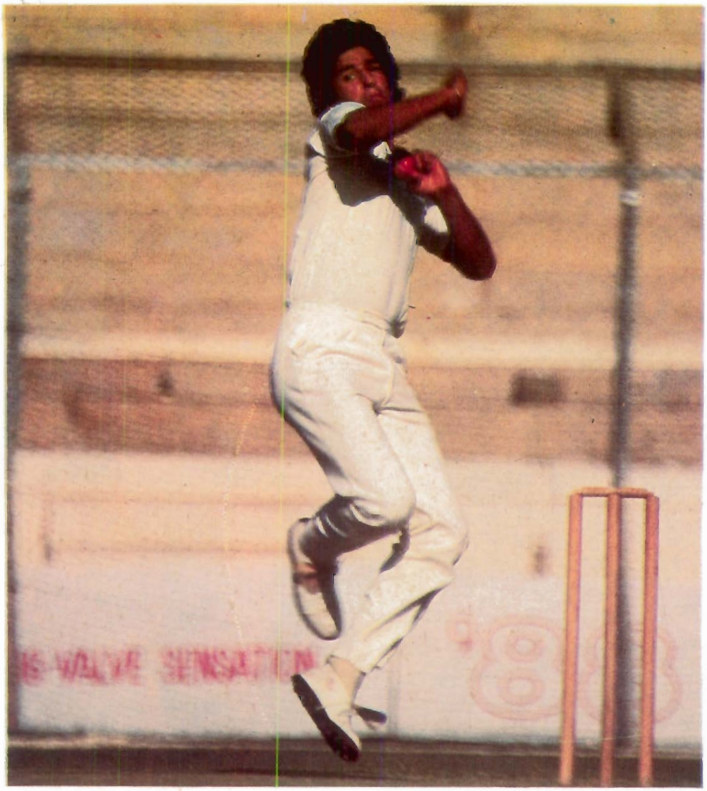

مہارت کی بلندی ۔ پی آئی اے کی جستجو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔
ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکران کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں جہاں
وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہوتے ہوں۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ ۔ لاجواب پرواز

UHU® یوہو کڈز کلب

دنیا کی سب سے اچھی GLUE بنانے والی مشہور زمانہ جرمن کمپنی UHU® (یوہو) نے قارئین آنکھ مچولی کے لئے پُرکشش CASH انعامات کا اعلان کیا ہے۔ درج ذیل سوالات کے درست جوابات ارسال کریں اور CASH انعامات حاصل کریں۔

پہلا انعام	2 ہزار روپے نقد
دوسرا انعام	1 ہزار روپے نقد
تیسرا انعام	500 روپے نقد

ہر درست حل پر ایک UHU® کی T. SHIRT

1. آئندہ ہونے والا کرکٹ ورلڈ کپ کس ملک اور کون سے سال میں منعقد ہوگا؟
2. ریاضی کا مضمون الجبرا کس مسلمان سائنسدان کی ایجاد ہے؟
3. نماز کتنے سال کی عمر میں فرض ہو جاتی ہے؟
4. اگر آپ اس لفظ کو پڑھ سکتے ہیں تو اس کو الگ الگ لکھ کر دکھائیں (کیلیکیگیلیجز)؟
5. اگر گائے کا سر مشرق کی طرف ہو تو اس کی دم کا رخ کس طرف ہوگا؟

شرائط

1: جوابات کے ساتھ ایک عدد UHU stic پر لپٹا ہوا پلاسٹک ریپر ضرور بھیجیں۔ 2: ایک سے زائد حل کی صورت میں ہر حل کے ساتھ UHU ریپر بھیجنا لازمی ہے۔ 3: انعامات کا فیصلہ ایک سے زائد درست جوابات کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ کیا جائے گا۔ 4: انعامات کا اعلان حتمی اور ناقابل چیلنج ہوگا۔ 5: تمام حل 15 جولائی تک لازمی آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کریں۔ 6: خوش نصیب انعام یافتگان کا اعلان اگست کے شمارے میں کیا جائے گا۔

Don't Say GLUE — Say UHU®

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر
سی
لکیر

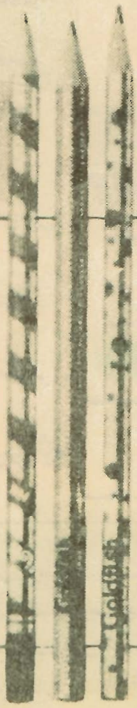

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 257.7392 - 95 (4 Lines)

جہاں چلے، رواں چلے

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کے تصدیق شدہ اشاعت
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن پاکستان جلڈرنز میگزین سوسائٹی

MEMBER APNS

محترم/صفر ۱۴۱۷ھ — جون ۱۹۹۶ء

مدیرِ اعلیٰ: ظفر محمود شیخ

منتظمِ اعلیٰ: تجمل حسین چشتی

مدیرِ اعزازی: ڈاکٹر طاہر مسعود

مجلسِ ادارت: محمد عمر احمد خان

مینیجر اشتہارات: عمران احمد

تزئین: دانش اختر

مصور: سلمان خان

فون نمبر: ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۷-اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

قیمت: ۲۵ روپے
۱۰ درہم ۱۰ ریال

ناشر: ظفر محمود شیخ - طابع: زاھد علی - مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

حُسنِ ترتیب

سنہرے حروف	محمد سلیم امام	۸
ماہِ رواں کی پہلی بات	مدیر آنکھ مچولی	۹
حمد باری تعالیٰ	سرور بجنوری	۱۰
نعتِ رسولؐ	ضیغم حمیدی	۱۱
بچّوں پر ظلم اور رحمۃ للعالمین	شیخ عبدالحمید عابدؔ	۱۲
زاہدہ بتول کی کہانی	فصیح باری خان	۱۵
بچوں کی حالتِ زار اور پاکستان	شہناز اختر	۲۱
روشنی کوئی نہ چھینے ان کی	آصف جاوید سکندر	۲۵
روز اغوا ہو رہے ہیں (نظم)	عبدالقادر	۲۸
ثمران کی کہانی	عبدالحمید عابدؔ	۳۰
تم کہاں ہو؟	ابوغازی محمّد	۳۳
ٹوٹے کھلونے	ادیب بتائیے انعام پائیے	۳۸
بچوں کی ہنسی کو بجھنے نہ دو (نظم)	محمّد جاوید خالدؔ	۴۸
یہ مظلوم بچّے	زبیدہ ھُما	۵۰
اسے کس جرم میں مارا گیا	مدیرِ آنکھ مچولی	۵۴
ایک بدنصیب بچے کا خط	محمد علی انصاری	۵۶
بچّوں کے حقوق کا چارٹر	قاضی فضل	۶۰
مقابلہ معلوماتِ عامہ	سلسلہ نمبر ۵	۶۶
زلاٹا کی ڈائری سے	شیخ عاکف حمید	۶۸
اللہ میاں کے پاس	فوحین	۷۴
کرو منظرِ جگر جائے چمن (نغمہ کشمیر)	عقیل مختار	۸۰
ماجد نہیں آئے گا	الطاف حسین	۸۴

حُسنِ ترتیب

کرکٹ کا جادوگر	سیّد یحییٰ حُسینی	۹۲
ننھّا انجینئر (نظم)	عمارہ احمد	۹۶
اس طرح تو ہوتا ہے	محمّد خُرّم معراج	۹۸
تجھے اے زندگی بتلاؤں کہاں سے	ممتاز حبیب صابر	۱۰۲
حادثہ	منوّر احمد صدیقی	۱۰۵
اسٹاف روم (ڈرامہ)	فصیح باری خان	۱۱۳
اور پھول کھِل اُٹھا	محمد عثمان بن سلیم	۱۱۸
آپ کا فرمانبردار شاگرد	فرحات احمد	۱۲۲
جواب کون دے گا	فرحین	۱۳۰
چیخیں	محمد مجاہد منہاس	۱۳۶
قدرت کے کرشمے	ظلِّ ھُما	۱۴۱
طائی کو کس نے مارا	عائشہ بلگرامی	۱۴۳
تھالیڈومائیڈ	شگفتہ ناز	۱۴۹
تین بچے تین کہانیاں	ادیبوں نے لکھا	۱۵۲
بچوں کی حفاظت	حفیظ الرحمٰن	۱۶۶
آپریشن ڈاکٹر نے کیا تھا	شبانہ رشید	۱۷۶
قاتل جو شہرت کا بھوکا تھا	عبدالستار خان طاھر	۱۸۰
ایک جنگل کی کہانی	محمد عادل منہاج	۱۹۰
بنام آنکھ مچولی	قارئین کے خطوط	۱۹۷
ننھّا قیدی	نصیر الدین حیدر	۲۰۱
گمشدہ جنت	شعاع نورین	۲۱۶

سلیم اختر

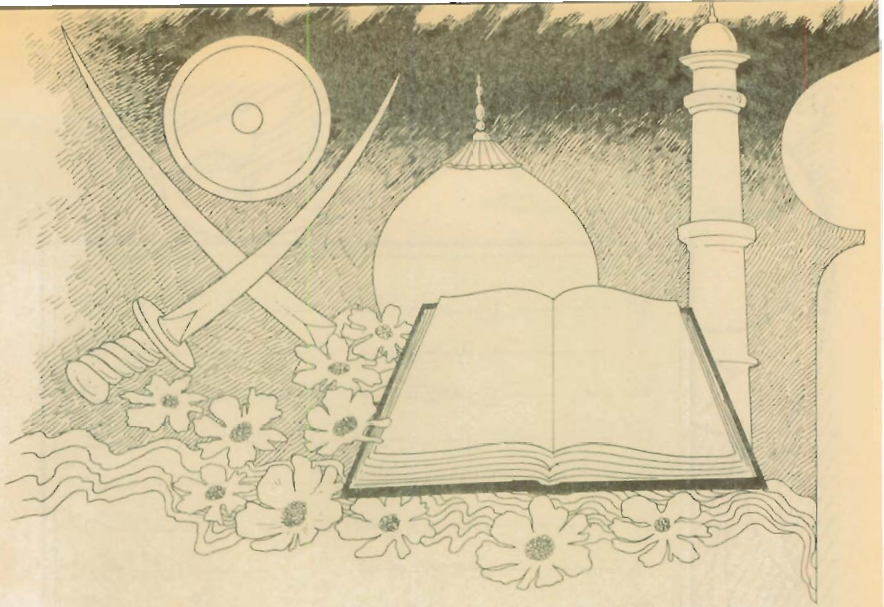

سنہرے حروف

محمد سلیم امام، متحدہ عرب امارات

ایک دن میسور کا بادشاہ حیدر علی شام کے وقت کوئمبور میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اچانک ایک بڑھیا اس کی طرف بڑھی اور اس کے پاؤں پر گر کر زار و قطار رونے لگی۔ حیدر علی نے بڑھیا کو اوپر اُٹھایا اور اس سے رونے کا سبب پوچھا۔ بڑھیا نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”شہر کا بڑا کوتوال آغا محمد میری بیٹی کو زبردستی پکڑ کر لے گیا ہے۔ میں نے قائم مقام کوتوال حیدر شاہ سے جا کر شکایت کی تو اس نے شکایت سننے سے اِنکار کر دیا۔“

حیدر علی فوراً محل واپس آیا اس نے حکم جاری کیا کہ حیدر شاہ کوتوال کو بڑھیا کی شکایت درج نہ کرنے پر دو سو کوڑے مارے جائیں اس کے بعد حیدر علی نے اپنے آدمیوں کو بڑھیا کی بیٹی کی تلاش میں روانہ کیا تھوڑی دیر میں حیدر علی کے آدمی لڑکی کو واپس لے آئے اور ساتھ ہی آغا محمد کوتوال کا سر بھی لا کر حیدر علی کو پیش کر دیا۔

ماہِ رواں کی پہلی بات

محرم الحرام مُسلمانوں کے نئے سال کا پہلا مہینہ ہے۔ نیا سال آپ سب کو مُبارک ہو۔ نیا سال نئے جذبوں نئی اُمنگوں سے شروع ہوتا ہے۔ جو سال گزر گیا وہ اب واپس نہیں آئے گا۔ نئے سال کا آغاز نئے ولولوں سے کیجئے۔ یہ مہینہ صبرو برداشت، حق پر جمے رہنے اور ظلم کے آگے سر نہ جُھکانے کا درس دیتا ہے۔ اس مقدّس مہینے میں نواسۂ رسولؐ شہیدِ کربلا حضرت امام حسینؓ نے اپنے جانثار ساتھیوں کے ساتھ یزیدیت کے خلاف، ظلم و جبر کے خلاف عَلَمِ حق بُلند کیا اور حق کی خاطر لڑتے ہوئے کربلا کے میدان میں جام شہادت نوش کیا..... حضرت امام حسینؓ کی قُربانی تا قیامت یاد رکھی جائے گی اور مظلوموں کو ظلم کے خلاف لڑنے کا حوصلہ بخشتی رہے گی.....

مظلوم بچّے نمبر خاص نمبر نہیں بلکہ ظلم کے خلاف للکار نمبر ہے۔ ملک بھر کے علاوہ دُنیا بھر میں جہاں جہاں بچّوں کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے اور ان پر ظلم و ستم ہو رہا ہے۔ یہ خاص نمبر اس کے خلاف ایک آواز ہے..... اس خاص نمبر کی تیاری کے سلسلے میں بے شمار تحریریں موصول ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ ایسی تصویریں بھی موصول ہوئیں جن میں معصوم بچّوں کے جسموں کو جگہ جگہ سے کاٹ پیٹ دیا گیا ہے۔ یہ خون میں ڈوبی ہوئی تصویریں چیخ چیخ کر انصاف مانگ رہی ہیں اور ظالموں کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کر رہی ہیں۔ خون میں ڈوبی ہوئی یہ تصویریں ہم چھاپنا نہیں چاہتے کہ اس سے کسی کو رُلانا، غمزدہ کرنا یا کوئی شہرت حاصل کرنا ہمارا مقصود نہیں۔ ہاں مظلوم بچّے نمبر چھاپ کر ہم ان مکروہ چہروں کو ضرور بے نقاب کرنا چاہتے ہیں جو ہزاروں لاکھوں معصوم بچّوں اور ان کے والدین و عزیز و اقارب کے مُجرم ہیں۔ ہم مظلوم بچّے نمبر کی اشاعت کے ذریعے مظلوم بچّوں پر ہونے والے ظُلم کی تصویریں پوری دُنیا اور ان حکومتوں اور انتظامیہ کو دکھانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھوں میں لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ذمّہ داری دی گئی ہے۔ یہ ذمّہ داری نہایت مشکل ہے نہایت کٹھن ہے۔ لیکن اس سے عہدہ برا ہونے والے اس میں پورا اُترتے ہیں اور لوگوں کی جان و مال اور عزّت و آبرو کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیتے ہیں۔ شیر شاہ سُوری کے دورِ حکومت کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا اس دورِ حکومت میں جس علاقے میں کسی بھی فرد کا بے قصور قتل ہوا تو اس علاقے کے ذمّہ دار کوتوال کا سر قلم کر دیا گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو جب حکومت کی ذمّہ داری دی گئی تو آپ رونے لگے۔ رونے کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا۔ "اس بات سے روتا ہوں کہ خدا کی قسم! دریائے دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا سو گیا تو اللہ کے دربار میں اس کا جواب مجھے ہی دینا پڑے گا!!"

مظلوم بچّے نمبر کی اشاعت ذمّہ دار انتظامیہ اور حکومتوں کے آگے ایک سوال ہے ایک ایسا سوال کہ لوگوں کی جان و مال اور عزّت و آبرو کی جو ذمّہ داری انہیں دی گئی ہے کیا انہیں اس پر پورا اُترنے کا احساس بھی ہے یا نہیں؟ اپنے ضمیر کی عدالت میں نہیں تو اپنے اللہ کی عدالت میں ایک دن انہیں اس ذمّہ داری کا جواب ضرور دینا ہوگا!!

حمد باری تعالیٰ

شاعر : سرور بجنوری
انتخاب : نعیم احمد نعیم

یا خُدا تیرا نام سچّا ہے
تیرا سارا کلام سچّا ہے

تو ہے ذات وصفات میں یکتا
کام تیرے ہیں عقل سے بالا

جلوہ گر تیری قدرتیں ہر سُو
نظر آتا ہے جگ میں تُو ہی تُو

تیری قدرت کمال کرتی ہے
غم زدوں کو نِہال کرتی ہے

کیسے ہو تیری نعمتوں کا شُمار
تو نے ہر جگہ لگادیئے انبار

کیا ٹِھکانہ تری نوازش کا
لیکن انساں ہے پھر بھی ناشُکرا

اپنے بندوں کو رِزق دیتا ہے
جس سے ہر اک سرور لیتا ہے

نعت

ضیغم حمیدی

نہ کوئی ہے، نہ ہوگا صاحبِ قرآن ایسا
جو خود محبوبِ رب ہو، ہے کوئی انسان ایسا

میں سر تا پا نچھاور اس کی ذات پاک پر ہوں
وہ میرے دل کے جیسا اور میری جان ایسا

فقیروں کی فقیری جس کے آگے سرنگوں ہے
بتاؤ اور بھی ہے کیا کوئی سلطان ایسا

قسم ایمان کی ایمان کو خود ناز جس پر
وہ صادق اور امیں، اک صاحبِ ایمان ایسا

قناعت اور صبر و شکر کے پکوان جس پر
نہ خود کھا کر کھلائے، اس کا دسترخوان ایسا

سبھی ذی شان ضیغم اس کی چوکھٹ کے بھکاری
زمانے میں نہیں آیا کوئی ذی شان ایسا

بچوں پر ظلم اور رحمۃ للعالمین کا پیغام

شیخ عبدالحمید عابد

رحمتہ للعالمینؐ کا لایا ہوا دین ہی وہ دین ہے جس نے حقوق و فرائض کے تعین میں چھوٹوں اور بڑوں کے درمیان کسی تمیز کو روا نہیں رکھا۔ معاشرے میں عدل و انصاف اور امن و سلامتی کے قیام کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ حقوق و فرائض کے تعین کے بارے توازن و اعتدال سے کام لیا جائے۔ اسی سے باہمی احترام و محبت و باہمی خیر سگالی اور خیر خواہی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور اسی سے سوسائٹی کے ہر فرد کی ذہنی و جسمانی قوتیں اور صلاحیتیں پوری طرح نشوونما پا کر انسانی تمدّن و معاشرت کی تعمیر کا ذریعہ بنتی ہیں۔

بڑے اور چھوٹے کے درمیان حقوق و فرائض کے اسی توازن کو اپنے حکیمانہ انداز میں ہادی انسانیتؐ نے ایک مختصر سے فقرے میں اس طرح بیان کیا :

"اولاد کو عالم وجود میں لانے کا واسطہ اس کائنات کے خالق نے ماں باپ کو ہی بنایا ہے۔ اس لئے اولاد کا سب سے مقدّم حق ان پر یہ ہے وہ حتی المقدور ان کی زندگی کی حفاظت کریں۔ اس کے برعکس پیدا ہونے سے پہلے یا پیدا ہونے کے بعد انہیں مار دینا بدترین سنگ دلی بھیانک ظلم و انتہائی بُزدلی اور دونوں جہاں کی تباہی ہے۔

اسلام سے پہلے عرب اور دوسرے ممالک میں اولاد کو قتل کرنے کا رواج عام تھا۔ اس وحشیانہ اور ظالمانہ رواج کی تین وجوہات تھیں۔ ان میں سے ایک وجہ مذہبی تھی۔ ماں باپ اولاد کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے ذبح کر کے ان پر چڑھا دیتے تھے۔ منّت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگیا تو اپنے بچّے کی قُربانی دیں گے۔ یہ قابلِ نفرت رسم صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ بہت سی بُت پرست قوموں میں تھی۔ رومتہ الکبریٰ کے متمدّن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو مکمل اختیار تھا۔ اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ بکثرت رواج تھا۔

اولاد کشی کی دوسری وجہ عربوں کا عام فقروفاقہ اور ان کی معاشی بدحالی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس لئے وہ اس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر اپنے آپ کو اس غرض سے سبکدوش سمجھ لیتے تھے۔

اولاد کشی کی تیسری افسوسناک صورت لڑکیوں کا زندہ دفن کردینا تھا کیونکہ انہیں ننگ و عار کا موجب سمجھا جاتا تھا۔ باپ اس شرم و عار کے مجسّمے کو خاک کے پردے میں چھُپا کر اپنے آپ کو اس مصیبت سے بچانے کی فکر کرتا تھا۔

رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے چمنستانِ انسانیت کے ان نونہالوں پر اس ظلم و ستم کو روکنے کی ایسی تدابیر اختیار کیں جن کی بدولت ان کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ان کے حقوق متعیّن کئے، ان کی ہلاکت کو بدترین جُرم قرارم دیا۔ اللہ کی رحمت و عنایت اور دُنیاوی و اخروی کامیابی کا حصول اولاد کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کو قرار دے کر ماں باپ کے دلوں اور ذہنوں میں ان کی اہمیت و عظمت کا احساس پیدا کیا۔ ارشاد خداوندی ہے :

"اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے دیوتاؤں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنادیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں۔"
(سورہ انعام آیت ۱۳)

قرآن مجید نے اولاد کے قتل کو معاشرے کے لئے تباہی و بربادی اور خسران کا سبب قرار

دیتے ہوئے ایسے سنگدل ظالموں کو متنبہ کیا :

"یقیناً" خسارے میں پڑگئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا۔" فقر و افلاس کے خوف سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کو اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کرنے والوں کو اس وحشیانہ اور سفاکانہ جرم سے باز آنے کا حکم دیتے ہوئے ان کے وہمی خطرات و وسوسات کا اس طرح ازالہ کیا :

"اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔" (سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۱)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپؐ ان لوگوں کے سامنے اعلان فرمادیں کہ درج ذیل امور کا ارتکاب حرام ہے :

"اے نبیؐ ان سے کہو آؤ میں تمہیں سُناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مُفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔" (سورہ انعام آیت ۱۵۱)

مُسلم کی ایک روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضور اکرمؐ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

"خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور بچیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے۔"

قرآن و احادیث میں بیان کی ہوئی باتوں کی حیثیت صرف وعظ و نصیحت کی نہ تھی بلکہ اسلامی قانون میں اولاد کا قتل ایک فوجداری اور قابل مواخذہ جُرم قرار دیا گیا۔ بچے کے خون اور اس کی جان کی اہمیت و قیمت جوان انسان کے خون اور جان کے برابر قرار دی۔ نہ باپ کو یہ حق رہا اور نہ ماں کو کہ وہ کسی مذہبی و معاشی اور معاشرتی جذبے کے تحت اپنی اولاد کی جان تلف کرسکے۔ یہ اسلام ہی کا فیض تھا کہ عرب کے معاشرے میں نہ صرف اولاد کشی کے گھناؤنے رواج کا کلی طور پر خاتمہ ہوگیا بلکہ بچوں کا تحفظ' ان سے محبت و شفقت کا ایک نیا دروازہ بھی کھُل گیا۔

خلیل جبران کے اقوال

☆ "کسی کو بے وقوف نہ کہو کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم دانا ہیں نہ بے وقوف۔ ہم زندگی کے درخت پر سبز پتوں کی طرح ہیں۔"

☆ "محبت ایک نورانی قلعہ ہے جسے نورانی ہاتھوں نے نورانی کاغذ پر لکھا ہے۔"

مرسلہ ... نادیہ کوثر

زاہدہ بتول کی کہانی

فصیح باری خان

زاہدہ بتول ہم سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی ہمارے درمیان موجود نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی اسے دیکھتا تھا تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ کیا ہے؟ بارہ برس کی لڑکی یا کوئی بُڈھی روح کہ جو سارا دن الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھی سب کو لاتعلق بن کر دیکھتی رہتی ہے۔ میرے سارے بہن بھائی کتنے ہی جھگڑالو اور بدتمیز ہی سہی مگر نجانے کیوں مجھے ان سے بڑی اُنسیت ہے۔ ٹھیک ہے کہ غصّہ میں ان کے اوپر لاتوں، گھونسوں سے لے کر اپنے بہاولپوری کھُسّے بھی آزما لیتا ہوں۔ لیکن مجھے ان سے پیار ہے۔ نجانے یہ عجیب انہونی بات ہے کہ زاہدہ بتول کے لئے میں نے کبھی یہ اپنائیت اپنے دل میں محسوس نہیں کی۔ اس کے ساتھ میرا رویّہ اپنے بُڈھے دادا جیسا ہوتا تھا کہ جس کے سامنے میں خاموشی سے سر جُھکائے بیٹھا رہتا تھا یا

پھر کبھی کبھی ہوں ہاں کردیتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ زاہدہ بتول کو مجھ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرپاتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اکثر ننھے ننھے دیئے جل اُٹھتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے اپنا کوئی کام کرنے کا کہوں۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ گذشتہ تین چار سالوں سے میں نے اس سے ایک گلاس پانی بھی نہیں مانگا ہوگا۔

ہمارے گھر کا ماحول بڑا شور شرابے والا ہے۔ بہت سارے بہن بھائی ہیں پورے گیارہ۔ سارا سارا دن وہ چیخ وپکار کہ لگے جیسے شہر میں بلوہ ہورہا ہو اور پھر سچی بات ہے کہ اماں اور بابو کی جمع کی ہوئی اس بھیڑ میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں چُپ چاپ مسہری کے نیچے سے چپل نکالتا ہوں اور کئی کئی گھنٹے کے لئے غائب ہوجاتا ہوں۔ غائب تو زاہدہ بتول بھی ہوجاتی ہے۔ اصل میں، میں نے اسے راتوں کو بڑبڑاتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے آپ میں گُم عجیب سے بے ترتیب الفاظوں کو چھلنی سے چھان چھان کر ایک روحانی دُعا کا روپ دے رہی تھی۔ اس وقت میں ڈر گیا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ بارہ سالہ زاہدہ بتول نہیں بلکہ کوئی بہت بڑی اللہ کی بندی ہے۔ جب میرے ذکر کرنے پر اماں اور بابو نے بھی اسے دیکھا تو وہ کتنی دیر تک خاموش سے ہوکر رہ گئے۔ جانے کب بابو کی گہری آواز نے خاموشی کے تالاب میں پہلا پتھر پھینکا "زاہدہ بتول اب ہماری نہیں رہی....." "تو ....!" اماں اور میرے منہ سے ایک ساتھ بے اختیار نکلا بابو نے ایک طویل نظر آسمان پر ڈالی اور شہادت کی اُنگلی اُٹھا کر اوپر لے گئے۔ "اس نے وہاں کے لئے چُن لیا میری زاہدہ بتول کو" اس دن کے بعد سے اماں اور بابو نے آخر نمبر والے بلونگڑوں کو بھی سختی سے پابند کیا کہ وہ آتے جاتے زاہدہ بتول کے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کریں گے۔ زاہدہ بتول نے بلا وجہ گھر کے ماحول میں روحانیت بھردی تھی۔ مجھے تو یوں لگتا تھا کہ یہ ریاض الدین ریاض سہارنپوری کا گھر نہیں بلکہ کوئی خانقاہ ہو۔ جہاں آنے والے ہر شخص کا سر احترام سے جُھکا ہوا ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس ماحول سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

یہ اب سے کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ میں سونے کے لئے مسہری پر لیٹنے ہی والا تھا کہ زاہدہ بتول چُپکے سے آئی اور میرے سر پر سرسوں کا تیل ڈال کر مالش کرنے لگی۔ میں آہستگی سے بولا "رہنے دو زاہدہ بتول....." وہ پیار سے بولی "کتنی خشکی ہوگئی ہے آپ کے سر میں بھائی جان... سارا سارا دن اتنی موٹی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ مت پڑھا کریں اتنا....." وہ یوں باتیں کررہی تھی

جیسے مجھ سے بہت بے تکلف ہو۔

"زاہد بتول....!"

"جی...!"

"کچھ نہیں....!!"

"کہئے ناں ...؟" وہ اُداس ہو رہی تھی۔

"مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا۔ نہ اماں نہ بابو۔۔ اور نہ آپ ...!" اس کے لہجے میں کتنی اپنائیت تھی۔ مجھے نجانے کیوں اس وقت سرسوں کی طرح زرد زاہدہ بتول پر بہت ترس آیا۔

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔ شاید میں تھوڑی دیر بعد اس کے بالوں کو گڑیا اور مینا کے بالوں کی طرح بگاڑ ڈالتا لیکن جب میری نظر اس کے چہرے پر گئی تو میری آنکھیں آپ ہی آپ جُھک گئیں۔۔۔ وہ رات ۔۔۔ یہ رات ۔۔۔ آسمان ۔۔۔ ستارے۔ یہ سب کچھ ویسا ہی تھا شاید زاہدہ بتول بھی ویسی ہی تھی ہم دس سے بالکل علیحدہ سب سے مختلف.....

وہ میرے ہاتھ سے کھیلتے ہوئے بولی "کل رات میں نے ایک خواب دیکھا بھائی جان۔ ویسے تو روز ہی دیکھتی ہوں مگر کل بہت شدت کے ساتھ دیکھا...."

"کیسا خواب....؟" میں چونک گیا۔

"میں نے دیکھا...." وہ کہتے کہتے رک سی گئی۔ میرے کندھے پر اس نے اپنا سر ٹکالیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔ میں بھول گیا کہ وہ زاہدہ بتول ہے اوپر والے کی نجی ملکیت۔ میں اسے اپنے دس بلونگڑوں کی ہی صف میں لے آیا اور بڑے لاڈ سے اس کا سر تھپکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خاموش ہو گئی۔

"اب بتاؤ زاہدہ بتول تم نے کیا دیکھا؟"

"میں نے دیکھا موت زندگی کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔" اس کا پورا بدن موت کی ڈراؤنی تصویر بنا ہوا تھا۔ میرا بدن اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔

"ایسی باتیں مت کرو زاہدہ بتول....." یہ شاید میں نے ہی کہا تھا یا مجھ میں سرائیت کرتے خوف نے، مجھے نہیں معلوم۔

"مجھے اس شہر سے خوف آتا ہے بھائی جان ... مجھے آپ نانا کے پاس گاؤں بھیج دیں۔ میں معصوم بکریاں چراؤں گی.... نہر کے کنارے بیٹھ کر دیر تک خود سے باتیں کروں گی۔۔۔ جانتے ہیں بھائی جان میں کروڑوں بار مر چکی ہوں۔۔۔ ہر چلنے والی گولی پر زاہدہ بتول مرجاتی ہے اس سے تو اچھا ہے کہ گولی کوئی مجھے ایک بار ہی پورا پورا مار دے۔۔۔ بھائی جان کیا اس شہر میں کوئی اور بھی میری طرح سوچتا ہوگا۔ کیا اسے بھی وہی کچھ محسوس ہوتا ہوگا کہ جو میں محسوس کرتی ہوں۔۔۔ کتنے دن ہو گئے بھائی مجھے نیند کا ذائقہ

خوب سے خوب تر

حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں۔

☆ امیروں کی تواضع خوب ہے اور غریبوں کی خوب تر۔

☆ توبہ بوڑھے سے خوب ہے اور جوان سے خوب تر۔

☆ سخاوت مال دار سے خوب ہے اور مفلس سے خوب تر۔

مرسلہ ... عدنان فیصل

چکھے ہوئے۔۔۔ میری آنکھوں کو چھو کر دیکھئے آپ کو نہیں لگتا کہ یہ پتھر کی ہو گئی ہیں.....؟"

میں اس کا باتوں کی لہروں میں بہتا ہوا جانے کس سمت نکل پڑا اور وہ اتنی خاموشی سے اُٹھ کر چلی گئی کہ مجھے خبر تک نہ ہوئی۔

صبح ہوئی تو زاہدہ بتول اسی طرح انجان تھی۔

اس نے بڑی خاموشی سے ناشتہ کیا اپنا بستہ اُٹھایا اور اسکول کی طرف چل پڑی۔ میرا جی چاہا کہ اس کا راستہ روک لوں اس کے بستے کو واپس اس کی جگہ پر رکھ دوں مگر نجانے کیوں مجھے آج پھر زاہدہ بتول کا سامنے کرنا خاصا کٹھن لگ رہا تھا۔

آفس جاکر بھی میرا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ یوں ہی کُرسی پر بیٹھا اپنے باس کا واہیات کارٹون بنا رہا تھا کہ یکدم میرے کان میں فون کی بیل بڑی ہی بد تمیزی سے چیخی۔ میں نے بڑی بے دلی سے فون اُٹھایا۔ دوسری طرف بابو تھے۔ جانے وہ کیا کہتے رہے۔ میں ریسیور پھینک کر فوراً" باہر بھاگا۔ کب میں گھر پہنچا مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔

زاہدہ بتول سفید مسہری پر خون میں لت پت پڑی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح اس کی سمت دوڑا۔ جی میں آئی کہ اپنی ننھی منی بہن کو بازوؤں میں بھر کر زور زور سے بین کروں۔ لیکن جب میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔۔ یوں لگا کہ میں زاہدہ بتول کو سب میں شمار کرکے اس کی شان میں کوئی بڑی گستاخی کر رہا ہوں۔ بابو میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولے "زاہدہ بتول مر گئی ہے.... اسکول سے نکل رہی تھی کہ سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کی فائرنگ سے .... نامعلوم دہشت گردوں کے ہاتھوں....." بابو اور بھی کچھ کہتے رہے لیکن میں نے نہیں سُنا گھر سے باہر نکل گیا۔۔۔ گلی کے آخری کونے پر پہنچ کر میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور پھر خود بخود آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔

میں گلی کے کونے پر اکڑوں بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا!!

بنا اس کے کوئی نہیں ہے سہارا

شبنم عمر

جھینگوں کے ڈھیر پر یہ جل پریاں
نہیں اِنسان کے بچے ہیں!!

کچھ نہیں چاہئے تجھ سے اے مری عمرِ رواں   مرا بچپن، مرے جگنو، مری گڑیا لا دے

ستارے بکھیرتی ہوئی اس ننھی بچی کی گڑیا کون چھین لے گیا ہے؟

آنے والے اچھے مستقبل کی جھلک کیا اِن آنکھوں میں نظر آ رہی ہے؟

تم ایسا کرنا کوئی جگنو کوئی ستارہ سنبھال رکھنا
میرے اندھیرے کی فکر چھوڑو بس اپنے گھر کا خیال رکھنا

چیونٹی بھی تو اپنی جسامت سے زیادہ وزن اُٹھاتی ہے!!

ہے محنت کے بل پر ہی جینا ہمارا

بچوں کے حقوق کا معاہدہ ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے منظور کیا تھا جس کی منظوری پاکستانی حکومت نے اس شرط کے ساتھ دی تھی کہ ان پر اسلامی قوانین اور اقدار کے مطابق عمل کیا جائے گا۔
اس خاص نمبر میں جنرل اسمبلی کے بچوں کے حقوق سے متعلق اہم نکات، ذمہ داران کی توجہ کیلئے ایک بار پھر پیش کئے جارہے ہیں!!

سلمان خان

اُٹھتے ہی نہ تھے ہاتھ پہلے اب اُٹھا لیتے ہیں ہتھوڑے۔

بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

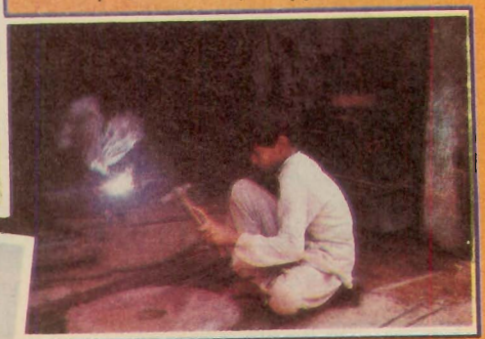

بیچ دیا بچپن رکھ لی ہے غلیل کاندھے پر

ہتھوڑے چلاتے، گارا بناتے، قالین بنتے، اینٹیں ڈھوتے اپنا بچپن کاندھوں پر اُٹھائے یہ ننھے منے پھول اقوام کے چارٹر نکات نمبر ۱ اور نکات نمبر ۱۸ کی نفی کر رہے ہیں!!

قالین بُنتے بُنتے کبھی سنہری خواب بُننے لگتا ہوں!!

رنگیلے کاغذ کی طرح زندگی ٹھہری اپنی

نکات نمبر ۳۲: حکومتِ وقت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ بچوں کو ایسے کاموں سے بچائے جس سے انکی صحت، تعلیم یا ذہنی و جسمانی ترقی میں رکاوٹ

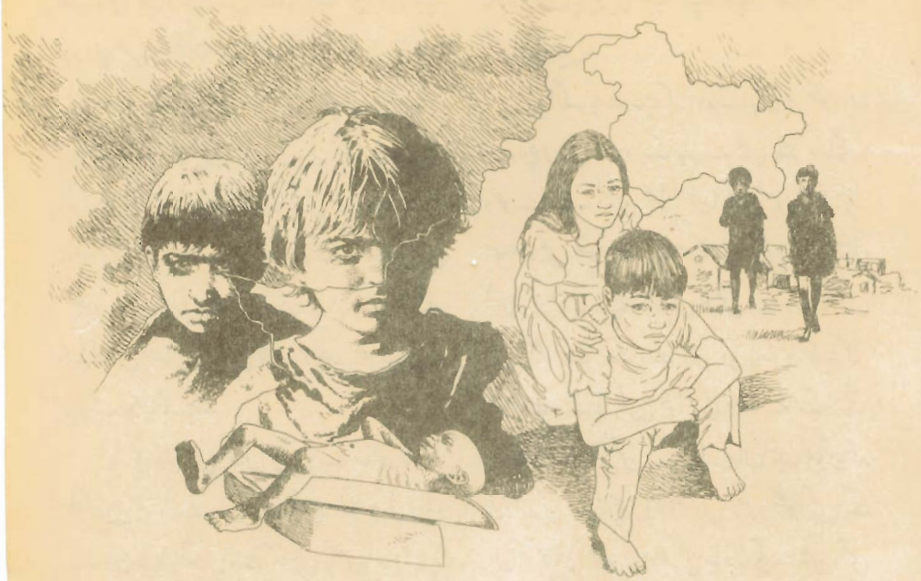

پاکستان میں بچّوں کی حالتِ زار

شہناز اختر

کسی بھی قوم کو اپنے مُستقبل کی کس قدر فکر ہے اس کا اندازہ اس کے بچّوں کے لئے بہبودی کاموں سے ہو سکتا ہے۔ باشعور قومیں ہمیشہ اپنی آنے والی نسلوں کو سنوارنے کے لئے اپنے قواعد و ضوابط پر دل سے عمل پیرا ہوتی ہیں لیکن ترقی یافتہ قومیں ہوں یا ترقی پذیر ممالک، بھوک و افلاس میں مبتلا سرزمین ہو یا آسائشوں سے بھرے خطے، کرہ ارض کا شاید ہی کوئی ایسا ٹکڑا ہو جہاں انسانوں کی نسل سے انسان ہی ناروا سلوک نہ کرتے ہوں، ترقی یافتہ قوموں سے لے کر ترقی پذیر اقوام تک تمام لوگ بچّوں کے ساتھ زیادتی کرنے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ کبھی کبھی لگتا ہے کہ انسان اپنی ہی نسل کشی کرنے پر تُل چکا ہے۔ کوئی وقت تھا کہ مصائب و آلام سے بچّوں کو بچایا جاتا تھا۔ انسان کے تو صحیح پسند عوام میں اس کے فوجی جان کا نذرانہ دیا کرتے تھے جبکہ آج اگر دیکھا جائے تو دنیا بھر میں ہونے والی جنگی تحریکوں میں بچّوں کے ہلاک

ہونے کی تعداد ۱.۵ ملین کے قریب پہنچ چکی ہے اور دنیا بھر میں نامُناسب نگہداشت کی بنا پر چار ملین معذور ہوچکے ہیں اور ایسے بچّوں کی تعداد پانچ ملین ہے جو اپنی پیدائش کی جگہ سے بوجہ بھوک و افلاس، بوجہ جنگ و جدل اور بوجہ سماجی ناہمواری ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ کیا کوئی ذی شعور سوچ سکتا ہے کہ ستاروں پر کمند ڈالنے والے اس انسان کی نسل کا ۲۵٪ فیصد بھوک کی بنا پر ہلاک ہوجاتا ہے۔

ساری دُنیا میں جہاں بچّوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان سے جبری مشقت لی جاتی ہے۔ ان کے ہاتھوں سے کتابیں چھین کر انہیں سڑکوں پر روزگار تلاش کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کے حقوق غصب کئے جاتے ہیں وہاں ترقی یافتہ اقوام یہ سُننے کے لئے قطعی تیار نہیں کہ وہ بھی بچّوں کے ساتھ ظلم کرنے میں برابر شریک ہیں کہ وہاں بھی ۹۰٪ فیصد بچے پرائمری تعلیم کا آغاز کرتے ہیں اور ان میں سے دو تہائی صرف چار سال تک اسکول جاتے ہیں لیکن اگر ایک نگاہ طائرانہ اپنے ملک میں بچوں کے لئے بہبودی کاموں ان کی صحت و تعلیم کے لئے سرکاری خرچوں و منصوبوں کا ذکر کیا جائے تو افسوسناک حد تک یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ پاکستان میں پچاس فیصد بچے آٹھویں تک اور ستّر فیصد بچیاں پانچویں تک پہنچتے پہنچتے تعلیم کو خیرباد کہہ دیتی ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ہاں ہر حکومت نے بچوں کی بہبود کے بارے میں بلند و بانگ دعوے کئے۔ لیکن عملاً" ایسا نظر نہیں آتا جبکہ ۱۹۹۴ء میں حکومت نے سرکاری سطح پر ہر پاکستانی شہری کو اپنے بچے تعلیم کی غرض سے درسگاہوں میں بھجوانے کے لئے زور دیا یہاں تک کہ حکومت نے تو شرح خواندگی بڑھانے کے لئے بڑے بڑے سلوگن دیئے بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ جو والدین اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھجوائیں گے ان کو قانونی طور پر سزا دی جائے گی۔ لیکن عملی طور پر ایسا کہیں بھی نظر نہ آیا۔

ہمارے ہاں بچوں کے ماہ بچوں کے سال اور بچوں کے نام پر تقریباً" موسوم کرنے کا تو رواج ہے لیکن کس قدر بدنصیبی ہے اس ملک کی جس کے پینتیس فیصد بچوں کے پاؤں میں جوتی نہیں، تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا نہیں اور ۶.۵۰٪ سے زیادہ بچوں کو مناسب خوراک نہیں ملتی اور پھر اس پر طُرّہ یہ کہ ایسے بھوک زدہ بچوں میں سے پچاسی لاکھ بچے ایسے ہیں جن سے جبری مشقت لی جاتی ہے۔ جبری مشقت لئے جانے والے بچوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ پچھلے برس تک یہ تعداد 30 لاکھ تھی جو بڑھ کر پچاسی لاکھ تک پہنچ

چکی ہے۔ ان بچوں سے مشقت اس قدر سنگین اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے منافی لی جاتی ہے کہ کبھی کبھی ان پھولوں پر کوئی آنسو بھی نہیں بہاتا جو بن کھلے مُرجھا جاتے ہیں۔

قالین سازی کی صنعت اور بھٹہ مزدوری ایسی مشقتوں میں شمار ہوتی ہیں جو انسان کو کئی قسم کی بیماریاں لگادیتی ہیں دمہ سے لے کر آنتوں کے کینسر تک کے مرض جب کمسنی میں لگ جائیں تو ایسے بچے کسی بھی قوم کے لئے کیا کرسکتے ہیں۔!!

ترقی پسند اقوام اگرچہ بھارت، نیپال، بنگلہ دیش، چین اور پاکستان میں بچوں کی حالت پر واویلا کرتی ہیں۔ یونیسف کی اپنی سروے رپورٹ میں اقرار ہوتا ہے :

"پاکستان میں غیر قانونی چائلڈ لیبر نہیں لی جاتی مس وانڈا ہی کے خیال میں "سیالکوٹ میں صنعتی اداروں کے دورے کے دوران انہوں نے کسی بچے کو کام کرتے نہیں دیکھا۔"

دوسری طرف سی "آر سی نے بچوں کی حالتِ زار سے متعلق حکومت پاکستان کی رپورٹ کو غلط قرار دیا۔

پاکستان میں بچوں کی حالتِ زار کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ہاں نوے فیصد والدین بچوں کو ان کی ضروریات بہم پہنچانے کے قابل ہی نہیں وہ محرومیوں اور جہالت کا شکار ہی نہیں بلکہ ان کے انداز سے کبھی کبھی شک ہونے لگتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے کا حصہ ہیں بھی یا نہیں۔ ہمارے ہاں ستر فیصد بچوں کو انسانی حقوق ہی میسّر نہیں اور 78 فیصد بچوں پر والدین اس لئے تشدد کرتے ہیں کہ والدین ان کا نان نفقہ پورا کرنے کے اہل نہیں۔

دُنیا بھر کے بیس کروڑ مزدور بچوں میں پاکستان کے پچاس لاکھ مزدور بچے بھی شامل ہیں۔ جن میں سے دس لاکھ قالین سازی میں روزانہ دس گھنٹے کام کر کے عام مزدوروں سے کم اجرت یعنی تیس سے چالیس روپے روزانہ تک کماتے ہیں۔ لیکن ایسے ساٹھ لاکھ پاکستانی بچوں کے بارے میں کسی کو سوچنے کی مہلت نہیں جو صرف پانچ یا دس روپے دہاڑی پر اپنا بچپن برباد کررہے ہیں۔ ایسے میں ترقی یافتہ قومیں اپنے ان تمام مظالم کو بھول جاتی ہیں جو وہ اپنے بچوں پر کرتی ہیں تب ویسٹرن میڈیا میں کوراسٹوری میں پاکستانی بچوں کی تصاویر لگا کر سانسوں کی بھیک مانگتے بچے کا کیپشن لگا کر ترقی یافتہ ممالک اپنے تئیں شاید طمانیت محسوس کرتی ہوں لیکن ہمیں تو ۱۹۹۴ء میں عالمی سطح پر بچوں کے لئے کسی بھی بڑے منصوبے پر کام نہ ہونے کی بنا پر اتنا ضرور دُکھ ہے کہ ایٹم بموں کی دوڑ میں شریک قومیں اپنی

نسلوں کے لئے لمحہ بھر بھی کیوں نہیں سوچتیں!!

ترقی یافتہ قوموں کو تو صرف سروے کرنے تک ہی شاید دلچسپی ہو لیکن عملی طور پر "ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن" نے منشیات اور بے راہ روی کے شکار دس کروڑ بچوں کے لئے کوئی بھی عملی منصوبہ نہیں بنایا اور نہ ہی گوئٹے مالا کے ان نوے فیصد مسٹریک بوائز کے بارے میں کوئی بات کی ہے جو منشیات کے بُری طرح عادی ہو چکے ہیں۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہاں اخلاقی و مذہبی اقدار اس قدر تو زندہ ہیں کہ سرکاری سطح پر "ہیومن رائٹس سیل" کا قائم ہونا بہت بڑی کاوش کہی جاسکتی ہے اور اس سیل نے حال ہی میں بچّوں پر مذہب کے نام پر ہونے والے ایک بڑے ظلم کو بے نقاب کیا۔ "ہیلاں" جو میانوالی کا مشہور قصبہ ہے وہاں بچوں کو مذہبی تعلیم دینے کے نام پر بیڑیاں پہنا کر حبسِ بے جا میں رکھا گیا اور بچوں کو ذہنی طور پر دنیاوی آسائشوں سے دور کرنے کے لئے مذہب کا نام استعمال ہوا جس کو "ہیومن رائٹس سیل" کی طرف سے ایک چھاپے کے بعد قانونی نرغے میں لیا گیا۔ حکومتی سطح پر اسی طرح کے اقدامات ہونے چاہئیں تاکہ بچّوں پر تشدد، بچوں سے جبری مشقت اور بچّوں کو کم اُجرت دینے کے مسائل پر قابو پایا جاسکے!!

آنکھ مچولی آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔ ہماری کاوش آپ تک اور آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے معاون ہمارے مددگار

صوبہ سرحد و پنجاب میں "آنکھ مچولی" کے ایجنٹ

نمبر	ایجنٹ	شہر	فون
۱	افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
۲	سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۳۹
۳	راولپنڈی نیوز ایجنسی	راولپنڈی	۵۵۵۶۱۹
۴	اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۲۳۱۰
۵	فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
۶	اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
۷	سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
۸	پاکستان اسٹنڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
۹	خالد بک اسٹال	گجرات	۲۷۳۱
۱۰	طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
۱۱	چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یارخان	۲۶۲۶،۲۷
۱۲	مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
۱۳	رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
۱۴	رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاولنگر	
۱۵	ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
۱۶	سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
۱۷	اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹
۱۸	کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷

خط و کتابت کے لیے سرکولیشن مینجر" ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

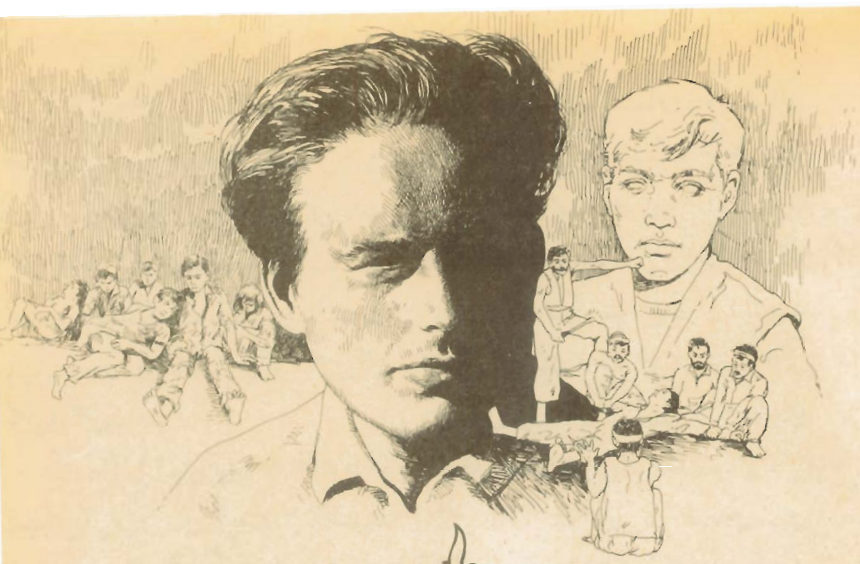

کوئی نہ چھینے ان کی

آصف جاوید سکندر

اس بچے کی عمر تین سال سے زیادہ نہ تھی اس کی آنکھیں زخمی تھیں اور وہ ایک بھکاری کی گود میں سو رہا تھا۔ اس بچے کی زخمی آنکھوں نے میرے دل میں عبدالمجید کی یاد تازہ کردی تھی۔ میں نے پلٹ کر اس بچے کی آنکھوں کو غور سے دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس بچے کی آنکھوں کے ساتھ بھی کہیں وہی کچھ تو نہیں کیا گیا جو عبدالمجید کی آنکھوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مگر میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا کیونکہ اس بچے کی آنکھیں بند تھیں اور وہ سو رہا تھا۔

"ممکن ہے اس کی آنکھوں میں کوئی معمولی تکلیف ہو جس کی وجہ سے وہ سوجھی ہوئی اور زخمی سی نظر آرہی ہوں۔"

یہ سوچ کر میں اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا کچھ ہی دیر بعد بس آگئی۔ بس میں زیادہ رش نہیں تھا۔ مجھے سیٹ مل گئی۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی میرا

پیچھے کی طرف ماضی میں سفر کرنے لگا۔ میرے تصوّر میں عبدالمجید کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی یاد نے میری آنکھوں کو نم کردیا تھا۔ پتہ نہیں وہ اب کہاں ٹھوکریں کھا رہا ہوگا۔ ظالموں نے اپنے تھوڑے سے فائدے کے لئے نہ صرف اسے ماں باپ سے دور کردیا تھا بلکہ اس کی آنکھیں بھی چھین لی تھیں۔

مجھے وہ تقریباً" دس گیارہ سال پہلے ملا تھا جب اس کی عمر بیس برس تھی۔ ہماری رفاقت چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکی۔ اگر میں اس کو نابیناؤں کے اسکول میں داخل نہ کرتا تو شاید آج بھی وہ میرے ساتھ ہی ہوتا۔ اسکول میں داخل ہونے کا تو اسے بہت شوق تھا مگر وہاں کا پابند ماحول اسے راس نہ آیا۔ اور ایک دن جب میں اس سے ملنے گیا تو وہ کہنے لگا۔ "احسان صاحب آپ مجھے اس اسکول سے واپس لے جائیں۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔" میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اسکول چھوڑنے پر بضد رہا۔ آخر میں نے جان چھڑانے کے لئے اسے کہا۔ "ٹھیک ہے مجید" تم آج کا دن تو گزارو میں کل پرنسپل سے بات کرکے تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔" اسے یہ کہہ کر میں پرنسپل صاحبہ سے ملا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا۔ "آپ تقریباً" ایک ماہ تک مجید سے ملنے نہ آئیں۔ یہ خود ہی آہستہ آہستہ اسکول کے ماحول سے مانوس ہوجائے گا اور پھر اس کا دل یہاں لگ جائے گا۔" پرنسپل صاحبہ کی یہ بات مان کر میں چلا آیا۔ مگر ایک ماہ پورا ہونے سے پہلے ہی مجھے فون پر یہ اطلاع ملی کہ مجید اسکول سے بھاگ گیا ہے۔ یہ خبر سُن کر میں نے کراچی جیسے پھیلے ہوئے شہر میں مجید کو تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجید بھی شاید خود میرے پاس اس لئے نہیں آیا کہ میں کہیں دوبارہ اسے اسکول نہ لے جاؤں۔ اسی تلاش میں کئی مرتبہ میں نے اس جگہ کے چکر لگائے جہاں اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے سڑک عبور کرنی تھی۔ اسی لئے وہ کسی کی مدد کا منتظر تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تو صرف اس لئے تھاما تھا کہ اسے سڑک کی دوسری جانب پہنچا کر چھوڑ دوں گا۔ مگر اس کی باتوں میں کچھ ایسا مگن ہوا کہ باتوں ہی باتوں میں اسے اپنے آفس تک لے آیا۔ کینٹین میں بٹھا کر ناشتہ کرایا۔ دوران گفتگو جب یہ پتہ چلا کہ اس کا یہاں کوئی خاص ٹھکانہ نہیں تو میں نے اسے اپنے ساتھ گھر جانے کی دعوت دے ڈالی جو اس نے قبول کرلی۔

آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے عبدالمجید کے لئے اتنا کچھ کیوں کیا۔ کیا اللہ کو راضی کرنے کے لئے یا اپنی آخرت سنوارنے کے لئے۔ تو جواب نفی میں آتا ہے کیونکہ اس وقت میں مذہب سے

بہت دور تھا۔ تو پھر بھلائی کا یہ کام میں نے کیوں کیا۔ شاید اس لئے کہ اس وقت میرے چھوٹے چھوٹے دو بچے تھے۔ اور عبدالمجید کو بُری حالت میں دیکھ کر مجھے دُکھ ہوا تھا کہ آخر یہ بھی کسی کا بیٹا ہے۔ اگر یہ میرا ہی بیٹا ہوتا تو کیا میں اسے ایسی حالت میں بے یارومددگار چھوڑ دیتا؟ ہرگز نہیں؟

اس دن جب میں عبدالمجید سمیت دفتر سے گھر پہنچا۔ تو میری بیگم نے بھی اس نابینا مہمان کا خوشدلی سے استقبال کیا۔ غسل کے بعد اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے اس سے پوچھا۔ "مجید ذرا اپنے ماضی کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ ماں باپ کے بارے میں تمہیں کچھ تو یاد ہوگا۔" مگر اسے کچھ یاد نہ تھا۔ کیونکہ بہت چھوٹی عمر ہی میں اسے اغوا کرلیا گیا تھا۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے نرغے میں پایا۔ جو بچوں پر ظلم و ستم کرکے ان سے بھیک منگوایا کرتے تھے۔ بچے جب عمر کے ایک خاص حصّے میں پہنچ جاتے تو وہ ظالم لوگ کسی کا ہاتھ توڑ دیتے، کسی کی ٹانگ توڑ دیتے اور کسی کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائی پھیر کر اندھا کردیتے بھیک سے انکار کرنے والے بچوں کو لوہے کی سلاخوں سے پیٹا جاتا۔

عبدالمجید نے وہاں کئی بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے اندھا ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس دن بچوں کو اندھا کرنا ہوتا تھا۔ اس دن پہلے ہی سے بچے منتخب کرلئے جاتے اور انہیں نشہ آور چیز کھانے میں ملا کردی جاتی تو وہ نیم بے ہوش ہوجاتے تھے۔ ان بے ہوش بچوں کو قطار میں لٹا دیا جاتا تھا۔ ایک آدمی ان بچوں کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں پر اپنے پیر رکھتا۔ دوسرا آدمی بچے کی ٹانگیں پکڑتا جبکہ تیسرا آدمی لوہے کی سلائی گرم کرکے بچے کی دونوں آنکھوں میں پھیر دیتا۔ بے ہوش ہونے کے باوجود وہ بچہ تلملا اُٹھتا اور پھر جب اسے ہوش آتا تو اس کی دنیا اندھیر ہوچکی ہوتی تھی۔

اسی طرح ایک دن عبدالمجید کی باری بھی آگئی اسے یہ تو پتہ نہیں چلا تھا کہ کب اسے بے ہوشی کی دوائی کھلائی گئی اور کب اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیری گئی۔ اس کی دنیا اندھیر ہوچلی تھی۔ ظالموں نے اس کی آنکھوں کا نور چھین لیا تھا۔

"روک کے استاد!" کنڈیکٹر کی چیختی چلاّتی آواز مجھے اپنی دنیا میں واپس کھینچ لائی۔ میرا اسٹاپ آگیا تھا۔ میں بس سے نیچے اتر آیا۔

عبدالمجید وہ مظلوم بچہ جس کی روشنی گم ہوچکی تھی اور جس کی یاد چند لمحوں کے لئے میرے دل میں سمائی تھی .... زندگی کی گاڑی کی طرح اب کہیں آگے نکل گیا تھا۔

روز اغوا ہو رہے ہیں جابجا نونہال

عبدالقادر

کس نے چھینا ہے کراچی کے حسیں چہرے کا نُور؟
کس کے ہاتھوں سے ہوا ہے دورِ وحشت کا ظہور؟
خوشنما گلشن کو آخر کس کی نظریں کھا گئیں؟
ابرِ رحمت کی جگہ غم کی گھٹائیں چھا گئیں!
کیسے طاری ہوگیا گلزار پر دورِ خزاں؟
کل جہاں بادِ صبا تھی آج اُٹھتا ہے دھواں!
کس نے غارت کردیا اس شہر کا امن و سکوں؟
کیسے حاوی ہوگیا فہم و فراست پر جنوں؟

سر بریدہ ہورہے ہیں نونہالانِ وطن!
کوچہ و بازار میں لاشیں پڑی ہیں بے کفن!
جس طرف بھی دیکھتے ہیں خون کی برسات ہے
رنج میں ڈوبی ہوئی اس شہر کی ہر رات ہے
دورِ وحشت کی کہیں ملتی نہیں ایسی مثال
روز اغوا ہورہے ہیں چار جانب نونہال
اس لہو کا عکس ہوتا ہے شفق میں جلوہ گر
بہہ رہا ہے جو کراچی کے حسیں رُخسار پر
اے خدائے پاک تیرا اسمِ اعظم ہے "رحیم"
ہم پہ تو ہی رحم فرما صاحب عرش عظیم

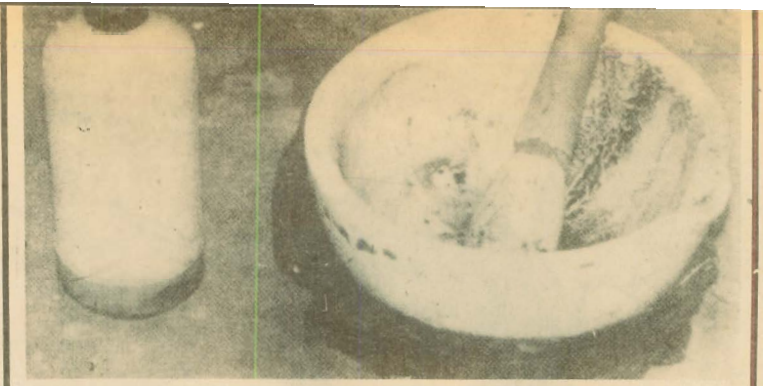

وہ ہاون دستہ جس میں ثمران کا دل اور گردے پیس کر محلول تیار کیا گیا ساتھ ہی تیار شدہ محلول بوتل میں

ثمران کی کہانی

عبدالحمید عاجز

قصور کے چھ سالہ ثمران کے قاتلوں نے اس کا پیٹ چاک کر کے دل اور گردے نکال لئے اور "دوری ڈنڈے" میں ڈال کر اس کا محلول کیا جسے ایک بوتل میں ڈال کر "عمل کرنے" کے لئے رکھ دیا گیا۔

یہ خبر پچھلے دنوں قومی اخبارات میں جلی حروف میں شائع ہوئی تھی اسے پڑھ کر انسانوں کا دل ضرور دُکھا ہوگا (شاید اس ملک کے صدر، وزیراعظم اور چیف آف آرمی اسٹاف کا بھی دُکھا ہو؟) اور ہر کوئی یہ سوچنے پر مجبور ہوا ہوگا کہ ایک ننھی سی جان کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کرنے والے انسان ہیں یا شیطان اس خبر کے پسِ منظر میں چلیں تو کہانی یہ سامنے آتی ہے: چھ سالہ ثمران قصور کی آبادی رکن پورہ میں مقیم ایک شخص حافظ محمد سعید کا بیٹا تھا۔ گھر کے افراد اسے پیار سے شانِ الٰہی کہہ کر پکارتے تھے۔

ایک دن حافظ محمد سعید مغرب کی نماز ادا کرنے مسجد میں گئے اس وقت ثمران گھر کے قریب کھلے میدان میں کھیل رہا تھا۔ مگر جب وہ

معصوم ثمران جعلی پیر محمد رمضان

واپس آئے تو وہاں موجود نہیں تھا۔

جب وہ گھر سے گیا تب اس کی ماں اس کے چھوٹے بھائی کو نہلا رہی تھی۔ ماں نے کہا "آؤ ثمران تمہیں نہلادوں۔" بچّے نے کہا۔ "امی میں بعد میں آکر نہاؤں گا۔" اور پھر وہ نہ نہا سکا اور اس کی لاش کو ہی غسل دیا گیا۔

حافظ محمد سعید کے مطابق جب ثمران نہ ملا تو وہ پریشان ہوگئے اور بچے کو تلاش کرنا شروع کردیا اغوا کے دو روز بعد ثمران کی لاش قریبی کھیت سے ملی۔ بچّے کی لاش اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ اس کی بائیں ٹانگ اندر کی طرف مڑی ہوئی تھی دونوں ہاتھ اوپر کی طرف تھے اور پیٹ کے اندر اعضاء موجود نہیں تھے۔

ثمران کو قتل کرنے والا نام نہاد پیر محمد رمضان اور اس کا چیلا محمد یوسف تھا۔ جو شعبدہ باز تھے اور لوگوں کو اپنے کرتبوں سے مُتاثر کر کے ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ انہوں نے اپنا "عمل" مکمل کرنے کے لئے ننھے ثمران کو پہلے اغوا کیا اور پھر اسے قتل کر کے دِل گُردے، نکال کر محلول تیار کیا اور اسے بوتل میں بند کر کے رکھ دیا۔

حافظ محمد سعید کے مطابق نام نہاد پیر محمد رمضان کا چلا یوسف عرف پپو منڈی میں میرے بڑے بیٹے طارق کے ساتھ کام کرتا تھا اور اس کا

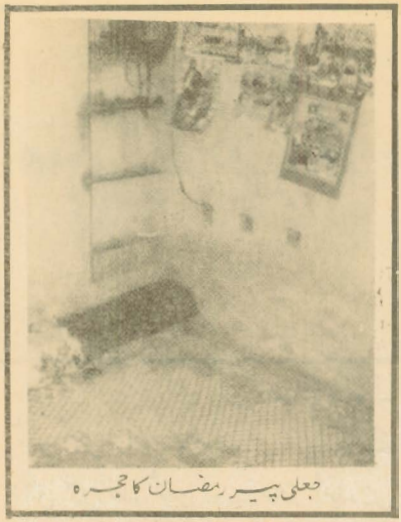

جعلی پیر رمضان کا حجرہ

ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ حافظ محمد سعید بڑے آزردہ لہجے میں بتاتے ہیں :

"میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ آستین کا یہ سانپ ہمیں ہی ڈس لے گا۔"

چیلے یوسف عرف پپو نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ "اڑھائی سال قبل اس کی ملاقات پیر محمد رمضان سے ہوئی تو وہ اس کا مرید ہوگیا اور جو وہ کہتا کرتا اور جو کماتا اس سے بیشتر رقم بھی اسے دیتا۔ پیر نے اسے کہا کہ تم نے ایک سال کا روزہ رکھنا ہے اور چائے کے سوا کچھ نہیں پینا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ پیر نے کہا کہ اس کے بعد میں تمہیں ایسا عمل بتاؤں گا کہ تم جس چیز کو ہاتھ لگاؤ گے وہ سونا ہوجائے گی۔ ایک روز اس نے کہا کہ میں نے تیرا عمل مکمل کرنا ہے تم مجھے کوئی بچہ لا کر

ثمران کا باپ حافظ محمد سعید ثمران کی والدہ

دو۔ میں اور پیر دونوں وہاں سے نکلے دیکھا کہ ثمران کھیل رہا ہے۔ کیونکہ میں اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ ثمران میرے ساتھ آگیا۔ میں نے پیر کے حکم پر یہ بچہ لاکر اسے دے دیا۔ پیر نے بچے کو پکڑا جیسے وہ مُرغا ہو اور پھر اس کا گلا دبا دیا۔ ننّھا اسی وقت مرگیا میں نے بچّے کو زمین پر پر لٹایا اور پیر نے چاقو سے بچے کا پیٹ چاک کر کے گُردے اور دل شاپر میں ڈال لئے ہم نے ہاون دستے میں مطلوبہ اشیا ڈال کر محلول تیار کیا اور عمل کے لئے رکھ دیا۔"

یہ تھا اس خبر کا پس منظر۔ دو شیطان نما انسانوں کا گھناؤنا فعل، جنہوں نے سونا بنانے کی خواہش کی ناپاک تکمیل کے لئے ننھے بے قصور ثمران کا قتل کر کے اس کے خاندان کو غم میں مبتلا کردیا۔

ثمران کا قتل ایک معصوم بچے کا قتل نہیں بلکہ ایک پورے خاندان کا قتل ہے۔ ایک ایسی

چیلا محمد یوسف جعلی پیر رمضان کی بیوی

اذیت ہے جو اس بچے نے تو بھگت لی لیکن اب گھر والے تمام زندگی بھر بھگتے رہیں گے۔

اسلام میں ہاتھ کے بدلے ہاتھ، ٹانگ کے بدلے ٹانگ، جان کے بدلے جان کی سزا کا تصوّر ہے لیکن ہم ایک اسلامی ملک میں رہتے ہوئے بھی اسلامی عدالتوں کا نظام نہیں بنا سکے ہیں۔ ابھی تک انگریزی عدالتیں اور انگریزی نظام ہمارے ملک میں رائج ہے جو سراسر ظالم کا نظام ہے جہاں مظلوموں کو کبھی اپنا حق وقت پر نہیں ملتا اور ان کی کبھی تسلّی و تشفی نہیں ہوتی۔

اس ملک میں اسلامی نظام اور اسلامی حکومت قائم ہوتی تو آج ثمران جیسے معصوموں کے ساتھ کبھی زیادتی نہ ہوتی اور اگر ہوتی تو مجرموں کے دِل گُردے اسی طرح نکال دیئے جاتے جس طرح انہوں نے معصوم ثمران کے نکالے تھے!!

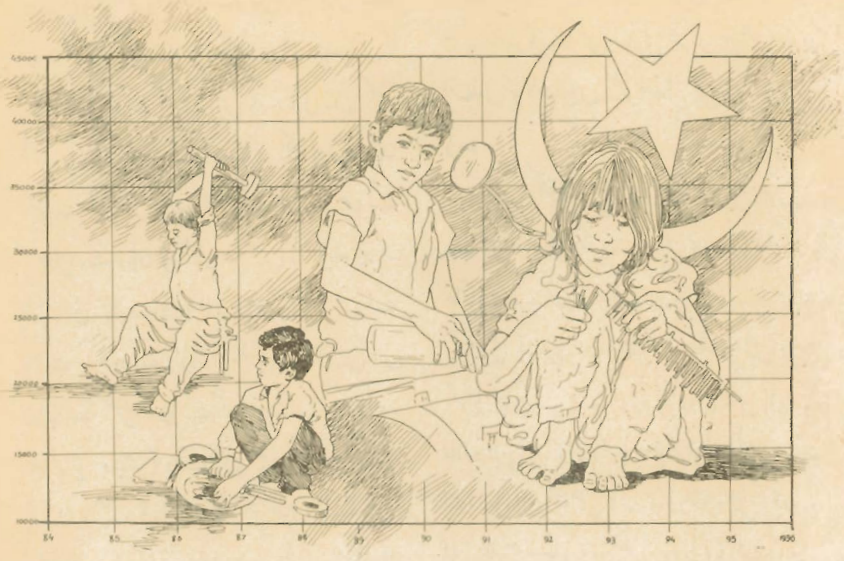

تم کہاں ہو؟

ابو غازی محمد

صادق کمال، عمر ۱۵ سال رنگ سانولا قد ۵ فٹ ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ۳۰ نومبر سے لاپتہ ہے۔ جن صاحب کو ملے براہ کرم نیچے دیئے گئے پتے پر پہنچا دیں۔ صادق

کمال اگر تم خود یہ اشتہار پڑھو تو بیٹا جہاں کہیں بھی ہو فوراً گھر آجاؤ تمہاری بیمار والدہ جدائی کے غم میں موت کے کنارے کھڑی تمہاری واپسی کی راہیں دیکھ رہی ہے۔ اور تمہارے بہن بھائی تمہارے گھر پر نہ ہونے سے بہت اُداس ہیں۔

تمہارا غمزدہ باپ
کمال احمد
۷۸۳/۱۱ ملت نگر کراچی

گمشدگی کے اس اشتہار کے پس منظر میں کتنے درد و غم اور کتنی بے بسی چھپی ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو زندگی میں کبھی آگ کے اس دریا سے ڈوب کر نکلے ہوں۔ جبکہ اکثریت کی نظر میں یہ الم ناک خبر روز مرہ کے معمول سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ زمانہ کی تیز رفتاری اور درپیش مسائل کے باعث پیدا ہونے والی افراتفری نے انہیں اس درجہ بے حس کردیا ہے کہ ان کے پاس ذرا دیر ٹھہر کر یہ سوچنے کا وقت بھی نہیں کہ صادق کمال اور اس جیسے کئی اور بچے آخر کہاں جاتے ہیں؟ وہاں ان پر کیا کیا ستم ڈھائے جاتے ہیں؟ پیچھے ان کے گھر والوں کے دن کس طرح گزرتے ہیں؟ سیاہ راتیں کیسے کٹتی ہیں؟ ہر اہم تہوار کے موقع پر انہیں اپنے درمیان نہ پاکر کتنے دامن آنسوؤں سے تر ہوتے ہیں؟ ان واقعات کو روز مرہ کا معمول بنانے والے لوگ آخر کون ہیں؟ اور انہیں اس گھناؤنے کاروبار میں کن کن بااثر افراد کی پشت پناہی حاصل ہے؟

جناب عبدالستار ایدھی صاحب اور جناب انصار برنی بچھڑے ہوؤں کو پھر سے ملانے کا قابلِ تقلید اور پُر خلوص مشن لے کر میدان میں اُترے ہیں اور ان کے ذریعے سے کئی سالوں سے اپنوں سے جدا ہونے والے بچے (جو اب جوان ہوچکے ہیں) اپنے والدین سے مل گئے ہیں۔ جن کی دُعائیں ساری عمران فرشتہ صفت انسانوں کو کامیابیوں کے حصول میں مدد دیتی رہیں گی۔

ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق ہمارے ملک میں ہر سال تقریباً ۴۰۰۰ بچوں کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ یہ تعداد صرف ان بچوں کی ہے جن کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس اسٹیشنز میں درج کرائی جاتی ہے جب کہ وہ ہزاروں کیس ان کے علاوہ ہیں جن کا اندراج کیا یا کرایا ہی نہیں جاتا۔ اغوا کی ان تشویش ناک وارداتوں میں ایک دو افراد کا نہیں بلکہ کئی منظم گروہوں کا "سیاہ ہاتھ" ہوتا ہے جن کے سرکردہ افراد کی رسائی بعض با اختیار حکام تک ہوتی ہے جو ہر آڑے وقت میں ان کی "غیر قانونی مدد" کرتے ہیں۔ ان سماج دشمن گروہوں کے کارندوں کا سب سے آسان ترین شکار وہ بچے ہوتے ہیں جو گھر والوں کی بے جا مار پیٹ سے تنگ آکر یا علم حاصل کرنے کا شوق نہ رکھنے کی وجہ سے گھروں سے بھاگتے ہیں۔ ان سفاک درندوں کی تیز اور تجربہ کار نگاہیں ایسے بچوں کو فوراً پہچان لیتی ہیں۔ اور پھر یہ لوگ نیک دل اور ہمدرد انسان کا خود ساختہ لبادہ اوڑھ کر ان کے قریب آتے ہیں اور مختلف حیلے بہانوں سے بہلا پھسلا کر پہلے ان بچوں کو

اعتماد میں لیتے ہیں اور اس کے بعد موقع ملتے ہی بے ہوش کردینے والی دوا انہیں کھلا یا پلا کر اڈا پر پہنچا دیتے ہیں۔ عموماً ایک شہر سے اغوا کئے گئے بچوں کو ملی بھگت سے دوسرے شہروں میں قائم گروہ کی شاخ میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ وہاں ان معصوموں کو بھوک اور پیاس کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر جانوروں کی مانند مارا پیٹا جاتا ہے۔ خوفناک نتائج بھگتنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور بھاگنے کی کوشش کرنے والے بچے کو پکڑ کر سب کے سامنے اس پر پالتو خونخوار کتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں جو لمحوں میں بچے کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

جو بچے شکل سے زیادہ معصوم دکھائی دیتے ہیں انہیں "بھیک سیکشن" کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ جہاں انہیں بھیک مانگنے کے نت نئے طریقے اور انداز سکھائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی کے ہاتھ پیر توڑ کر عمر بھر کے لئے معذور بنادیا جاتا ہے۔ کچھ کی آنکھیں نکال کر دنیا اندھیر کردی جاتی ہے۔ کسی کے ہونٹ کاٹ دیئے جاتے ہیں اور کچھ کی زبان کاٹ دی جاتی ہے اس پر بھی بس نہیں کی جاتی اور کئی کے چہروں پر تیزاب ڈال کر اس قدر مسخ کردیا جاتا ہے کہ جو دیکھتا ہے اس کے دل میں رحم اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ کیونکہ ان انسانیت سوز سلوک کرنے والوں کے مطابق "بچہ جتنا زیادہ عبرت ناک نظر آتا ہے کمائی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔"

ان بھکاری بچوں کو روزانہ صبح ہونے سے پہلے ہی گاڑیوں میں بھر کر شہر کے مختلف مصروف چوراہوں اور بازاروں میں بکھیر دیا جاتا ہے۔ اور ہر مقام پر گروہ کی طرف سے بھکاری کے روپ میں باقاعدہ ایک نگران مقرر ہوتا ہے جو تمام دن ان پر کڑی نگاہ رکھتا ہے رات کے کسی پہر میدان صاف دیکھ کر اچانک گاڑیاں آتی ہیں اور انہیں سمیٹ کر واپس اڈوں پر لے جاتی ہیں۔

جو بچے تیز طرار نظر آتے ہیں انہیں "چور سیکشن" میں چوری کرنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور پھر انہیں مختلف ذرائع سے بڑے گھروں میں ملازمت دلائی جاتی ہے۔ جہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد موقع ملتے ہی یہ کارروائی کرجاتے ہیں اور "مال" سردار کے قدموں میں لاکر ڈھیر کردیتے ہیں۔

۱۶ یا ۱۷ سال کی عمر کے اغوا شدہ بچوں کو (جو صحت مند اور مضبوط جسم کے مالک ہوتے ہیں) بیگار کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے جو زیادہ تر آزاد علاقوں میں بنائے جاتے ہیں تاکہ پولیس مداخلت نہ کرسکے اور اگر مداخلت کرنا بھی چاہے تو اس سلسلے میں وضع شدہ طویل طریقہ مداخلت

کے باعث اتنا وقت مل جائے کہ بیگار کیمپ کو فوری طور پر دوسرے محفوظ مقام پر منتقل کیاجاسکے۔ بیگار کیمپ کے "بڑے" مختلف چھوٹے تعمیراتی پروجیکٹ کا ٹھیکہ لے کر ان بچوں کو بطور مزدور استعمال کرتے ہیں اور اُجرت اپنے کھیسوں میں ڈالتے ہیں۔ انہیں اس انداز میں "پڑھا" دیا جاتا ہے کہ کسی کو شک تک نہیں ہوتا کہ یہ بچے یہاں بیگار میں کام کررہے ہیں۔

بیگار کیمپوں میں ان کی نگرانی گروہ کے کارندے بھی کرتے ہیں اور پالتو کتے بھی اس عمل میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ جوں ہی کوئی بچہ فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے موثر نگرانی کے باعث اسے فوراً پکڑ لیا جاتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر کتوں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے جو لمحوں میں اس کو بھنبھوڑ کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ دہشت ناک منظر بطورِ عبرت دوسرے "بیگاریوں" کو بھی دکھایا جاتا ہے تاکہ جو بھی فرار کا سوچ رہا ہو وہ اس احمقانہ ارادے سے باز آجائے۔

لگاتار شب و روز کی محنت و مشقت اور غذائی کمی کے باعث جب یہ "بیگاری بچے" کمزور ہوجاتے ہیں اور اس سیکشن کے قابل نہیں رہتے تو انہیں "بھکاری سیکشن" میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ جہاں انہیں "سکھا پڑھا" کر باقاعدہ طور پر "نفری" میں شامل کرلیا جاتا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں ہونے والی اونٹ دوڑ کے لئے بھی یہی گروہ بچے اسمگل کرتے ہیں اور اس کے عوض کثیر زرِ مبادلہ کماتے ہیں۔

بعض ایڈوانس قسم کے گروہ تو ظلم کی انتہا کردیتے ہیں۔ بچوں کو اغوا کرنے کے بعد بے ہوشی کی حالت میں ان کی آنکھیں، گُردے، دل، ہاتھ اور پاؤں تک کاٹ کر مختلف ہسپتالوں کو فروخت کردیتے ہیں۔

دُنیا کے ترقی یافتہ اور انسانی حقوق کے علم بردار ممالک (جن میں امریکہ سرفہرست ہے) کے میڈیکل ریسرچ سینٹرز کو فروخت کردیا جاتا ہے۔ یہ کام بھارت کے دو شہروں کلکتہ اور بمبئی میں بڑے پیمانے پر جاری ہے اور ہر سال ۱۸ ہزار بچوں کو اس کاروبار کی بھینٹ چڑھا کر قتل کردیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں دفعہ اے ۔ ۳۶۴ کے تحت اغوا کے مجرم کے لئے سزا کی حد سات سال سے نو سال قید بامشقت ہے اور اگر جُرم کی نوعیت سنگین ہو تو عمر قید اور پھانسی تک کی سزا بھی دی جاسکتی ہے لیکن پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کے ایک صفحہ پر کوئی ایسا مثالی واقعہ درج نہیں جس میں اغوا کے مجرموں کو عبرت ناک سزا دی گئی ہو!!

حیات عبداللہ

میرے مسیحا مرے قاتل نکلے

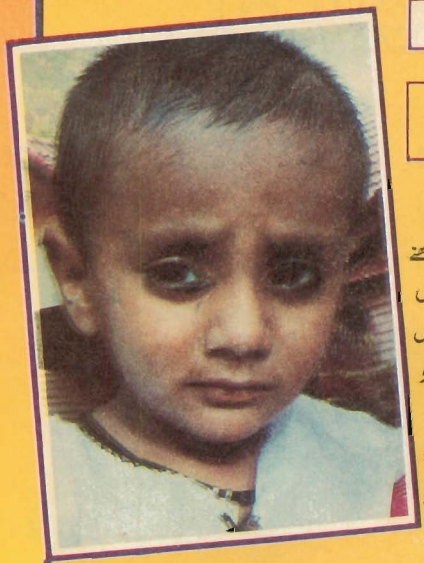

یہ بچہ جس کا نام شہزاد ہے۔ اس کے مرض کی ڈاکٹروں نے غلط تشخیص کی اور ڈرپ چڑھا دی۔ ڈرپ چڑھنے سے اس کی حالت غیر ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر بعد شہزاد موت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ڈاکٹر کی عدم توجہ اور لاپرواہی نے ایک پھول کو مسل دیا اور ایک خاندان کی خوشیاں لوٹ لیں... ڈاکٹر زجو مسیحا ہوتے ہیں جو زندگی کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو اپنی مہارت اور لگن کی ناؤ سے موت کی وادیوں سے چھڑا لاتے ہیں ایک ذرا سی لاپرواہی سے شہزاد کی زندگی کی ناؤ داؤ پر لگا بیٹھے!!

کچھ دیر تو انتظار کیا ہوتا

پندرہ اکتوبر ۱۹۸۹ء کی رات کا ذکر ہے۔ تقریباً گیارہ بجے امیر پور سادات کا ہر شخص نیند کی وادیوں میں غرق ہے ہم لوگ بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ ہمارے گھر کے ساتھ ہی ہمارے بڑے بھائی کا گھر ہے۔ رات میں اچانک شور ہوتا ہے "چور.... چور.... چور.... چور!!" ہم لوگ باہر نکلتے ہیں، پتا چلتا ہے بڑے بھائی کی چھت پر چور موجود ہے۔ میرے والد اور چھوٹا بھائی محمد اقبال ٹارچ لے کر چھت پر چڑھ جاتے ہیں۔ چھت کی پچھلی طرف سے بڑے بھائی کا لڑکا بندوق لے کر چور کی تلاش میں نکلتا ہے۔ چور تو بھاگ گیا لیکن بھائی کے لڑکے کی چلائی ہوئی گولی اقبال کے سینے میں لگ گئی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ مرنے کے بعد محمد اقبال کی کھلی آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں "گولی کیوں چلائی تھی کچھ دیر تو انتظار کیا ہوتا!!"

لوٹے کھلونے

بہت پہلے جب میرے کھلونوں کے ساتھ کھیلنے کے دن تھے میرے کھلونے ٹوٹ گئے۔ کھلونے کس طرح ٹوٹ جاتے ہیں؟ یہ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا۔ کھیل ہی کھیل میں کوئی

امی ابو کو مجھ سے بے حد محبت تھی کیوں کہ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ امی ابو کی صرف دو اولادیں تھیں۔ ایک میں اور ایک آپا۔ آپا کی خیر سے شادی ہوگئی تھی۔ ان کے شوہر بہت بڑے

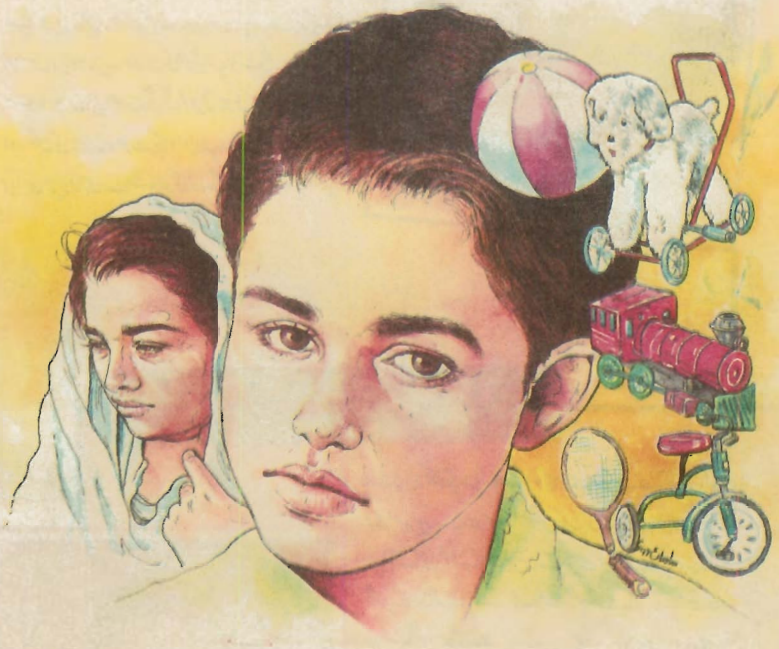

کھلونا ٹوٹ جاتا اور مجھے پتا بھی نہ چلتا۔ پتا اس لئے نہ چلتا کہ امی ابو میرے لئے دوسرے کھلونے لے آتے اور میں ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو بھول کر نئے کھلونوں کے ساتھ کھیلنے لگتا۔

تاجر تھے۔ ان کا وسیع کاروبار تھا۔ کار، جیپیں، کوٹھی، زمینیں اور ڈھیر ساری جائیداد کے وہ اکیلے مالک تھے۔

امی ابو کا خیال تھا کہ انہوں نے آپا کی

شادی بڑی اچھی جگہ کی ہے۔ آپا یقیناً" اپنے گھر میں بڑی خوش و خرّم ہوں گی' لیکن شاید انہیں اندازہ نہ تھا کہ خوشیاں روپے پیسے کی چمک دمک سے نہیں ملتیں۔ نہ ہی انہیں خریدا جاسکتا ہے یہ تو ہمارے اپنے اندر ہوتی ہیں۔ خود قربانی دے کر دوسروں کو دینے کے لئے' دوسروں کو خوش و خرّم رکھنے کے لئے۔ خوشیاں جو تتلیوں کے انمول رنگوں کی طرح ہوتی ہیں اور جب انسان خوش ہوتا ہے تو وہی انمول رنگ اس کی خوشیوں میں شامل ہوجاتے ہیں کبھی اس کے چہرے میں تو کبھی اس کی مُسکراہٹوں میں۔

خوشیاں وہی ہوتی ہیں جن کے عکس چہروں پر دھنک کے رنگوں کی طرح چمکتے ہیں۔ بہت پہلے خوشیوں کے رنگ تتلیوں کے رنگوں کی طرح میرے چہرے پر رقص کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کھلونے کس طرح ٹوٹ جاتے ہیں' غم کسے کہتے ہیں۔ دُکھ کیا ہوتا ہے اور درد کس طرح دل میں پلتے ہیں۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ کھیلنے کے دوران جب کوئی کھلونا مجھ سے ٹوٹ جاتا تھا تو مجھے اس کے ٹوٹنے کا پتا ہی نہ چلتا کیوں کہ امی ابو میرے لئے نئے کھلونے لے آتے تھے۔ شاید بہت دنوں تک مجھے اس بات کا احساس نہ ہوتا اگر امی ابو کے ساتھ کار کا حادثہ پیش نہ آتا۔ مری جاتے ہوئے ان کی کار ایک موڑ کاٹتے ہی ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں جاگری اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔

امی ابو کے مرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ کھلونے کس طرح ٹوٹ جاتے ہیں کیوں کہ ان کے مرنے کے بعد میں خود بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ خوشیاں مجھ سے روٹھ گئی تھیں اور ظاہر ہے کہ جب خوشیاں روٹھ جائیں تو کھلونے ٹوٹ ہی جاتے ہیں۔

امی ابو کی ناگہانی موت کے بعد مجھے دکھ اور غم کا احساس ہوا اور اس بات کا بھی پتا چلا کہ ہم انسان کھلونوں کی طرح ہیں۔ ذرا سی چوٹ لگی اور ٹوٹ گئے۔

امی ابو مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ میرے کھلونے ٹوٹ گئے تھے۔ وہ باغ مُرجھا گیا تھا جہاں کبھی خوشیوں کے رنگ برنگے پھُول کِھلتے تھے۔ باغ اس وقت ہرا بھرا رہتا ہے جب تک باغ کا مالی زندہ ہو۔ مالی مرجائے تو باغ بھی اُجڑ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے دل کا باغ بھی اجڑ چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے بہاریں مجھ سے روٹھ گئیں ہوں اور اب کبھی وہ واپس نہ آئیں گی۔

انسان ٹوٹ رہا ہو بکھر رہا ہو اور ایسے میں کوئی اسے ٹوٹنے بکھرنے سے بچائے تو وہ تمام

زندگی اپنے محسن کا احسان مند رہتا ہے ایسے ہی وقت میں جب کہ میں ٹوٹ رہا تھا بکھر رہا تھا آپا نے آکر مجھے مزید ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچالیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ ان کی شفقت، محبت اور ہمدردی نے میرے غموں کو کچھ کم کردیا۔ ماں باپ کی موت نے جو زخم میرے دل پر لگائے تھے، آپا کی محبت ان زخموں کا مرہم بن گئی۔ تسلّی و تشفّی دینے سے دُکھ کم نہیں ہوتے بلکہ دُکھ تو بانٹ لینے سے کم ہوتے ہیں۔ آپا اتنی اچھی تھیں کہ انہوں نے نہ صرف مجھے تسلّی و تشفّی دی بلکہ میرے دُکھ بھی بانٹ لئے۔ اپنے گھر میں لانے کے بعد انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے اسکول میں داخل کرادیا۔ اس طرح میرا دھیان پڑھائی کی طرف لگ گیا۔

آپا مجھے بڑا آدمی بنانا چاہتی تھیں۔ وہ پڑھائی کے دوران میرا بے حد خیال رکھتیں ساتھ ہی نصیحت بھی کرتیں۔ وہ کہتیں :

"خوب محنت سے پڑھو لکھو، تمہیں پڑھ کر بڑا آدمی بننا ہے" آپا جب یہ بات مجھ سے کہتیں تو میں ان سے پوچھتا :

"آپا! کیا بڑا آدمی بننے کے لئے پڑھنا لکھنا ضروری ہوتا ہے؟"

آپا کہتیں : "ہاں میرے پیارے بھائی! بڑا آدمی بننے کے لئے پڑھنا بے حد ضروری ہوتا ہے کیوں کہ علم سے ہی انسان کو عقل، شعور و آگہی ملتی ہے۔ علم ہی انسان کو انسانیت سے پیار کرنا سکھاتا ہے۔ بڑے چھوٹے کی اور اچھائی برائی کی تمیز دیتا ہے اور بڑا آدمی تمہیں معلوم ہے کون ہوتا ہے؟" آپا مجھ سے پوچھتیں۔

میں کہتا : "آپ بتائیں۔" وہ کہتیں :

"بڑا آدمی وہ ہوتا ہے کہ جو سب سے پیار کرتا ہو۔ دُکھ سُکھ میں لوگوں کے کام آتا ہو۔ خود قُربانی دے کر دوسروں کو آرام پہنچاتا ہو۔"

آپا کی باتیں بڑی اچھی لگتیں۔ ان کی باتیں سننے میں مجھے بڑا مزا آتا ہے۔ وہ اتنی اچھی اور اتنی پیاری باتیں کیا کرتیں جو سیدھی دل میں اتر جاتی تھیں۔

مجھے آپا سے بڑی محبت تھی اور وہ بھی مجھ سے بے حد محبت کرتی تھیں۔

گو گھر میں ہر طرح کا عیش و آرام تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ گاڑیاں تھیں۔ روپیہ پیسہ تھا۔ گھر پورا محل تھا، لیکن آپا خوش نہ تھیں۔ وہ اس لئے خوش نہ تھیں کہ ان کے شوہر ان سے بہت کم باتیں کرتے، گھر میں بہت کم آتے۔ ان کے ذہن پر ہر وقت اپنے کاروبار کو بڑھانے اور دور دور تک پھیلانے کا بھُوت سوار رہتا۔ وہ زیادہ تر اپنے کاروبار میں اُلجھے رہتے۔ انہوں نے آپا کو ایک بے جان گُڑیا سمجھ لیا تھا۔ وہ بے جان گڑیا

نہ تھیں۔ وہ انسان تھیں۔ ان کا دل چاہتا تو ہوگا کہ ان کے شوہر گھر پر آئیں تو ہنس بول کر ان سے باتیں کریں۔ گھر پر کچھ وقت دیں۔ انہیں سیر و تفریح کے لئے کہیں گھمانے پھرانے لے جائیں۔

آپا بڑی چاہ سے ان کے لئے اچھے اچھے کھانے پکاتیں اور ہر کھانے پر ان کا انتظار کرتیں۔ شوہر صاحب کبھی تو آتے ہی نہیں اور جب کبھی آتے بھی تو کہتے کہ بھئی میرے کھانے کی فکر نہ کیا کرو۔ میں نے آفس میں کھالیا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ آپا کے شوہر رات کے کھانے پر جلدی آنے کا وعدہ کرلیتے مگر وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرتے۔ آپا بے چاری ان کے انتظار میں کھانا لگا کر بھوکی ہی کرسی پر ٹک کر سوجاتیں اور جب رات گئے شوہر صاحب واپس لوٹتے تو آپا جاگ جاتیں۔ ان کے شوہر کہتے :

"ارے میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آج تمہارے ساتھ رات کا کھانا کھانا تھا' معاف کرنا مجھے یاد نہیں رہا۔"

آپا کہتیں' "کھانا تو کھا لیجئے۔ میں گرم کرکے لاتی ہوں۔"

وہ کہتے : "بھوک نہیں ہے۔ ہوٹل میں میٹنگ ..... تھی۔ وہیں تھوڑا بہت کھالیا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں جانے لگتے پھر اچانک جیسے انہیں کچھ یاد آجاتا وہ سوتی جاگتی آپا کو دیکھتے پھر پوچھتے :

"تم نے کھانا کھایا؟"

"نہیں!" آپا مختصر سا جواب دیتیں۔

"تو کھا لیا ہوتا!" وہ اپنے کمرے میں جانے لگتے پھر رُکتے اور کہتے :

"بھئی آئندہ کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا میں بہت مصروف انسان ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ سونے چلے جاتے اور آپا بے چاری بھوکی ہی سوجاتیں۔

بہت پہلے جب آپا کی شادی ہوئی تھی تو خاندان کے سارے لوگ یہی کہتے تھے کہ آپا کی قسمت بڑی اچھی ہے۔ انہیں دولت مند شوہر ملا ہے۔ اپنے گھر میں وہ عیش کریں گی۔ بے شک! ان کے شوہر بڑے دولت مند آدمی تھے۔ ان کے گھر نوکر چاکر اور روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ خود آپا کے پاس پہننے کے لئے ایک سے ایک بڑھیا کپڑا تھا۔ زیورات کی بھرمار تھی۔ دُنیا جہاں کی چیزوں سے ان کا گھر بھرا پڑا تھا لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود انہیں اپنے شوہر کی محبت میسّر نہیں تھی۔

دُنیا میں محبت سب سے بڑی چیز ہے۔ یہ وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں پرورش پاتا ہے' جو ہر غرض اور لالچ سے بے نیاز ہوتا ہے اور ویسے بھی جذبے وہی پاکیزہ ہوتے ہیں جو

لندیوں پر رہیں۔ بُلندیاں پاکیزگیوں کی امین ہوتی یں۔ جب کہ کثافتوں میں کیچڑ ہوتا ہے۔

آپا کو اپنے شوہر کی محبت میسر نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ خوش رہنے کی کوشش کرتیں۔ ایک مہربان مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر سجی رہتی۔ لیکن کسی کو اندازہ نہ تھا کہ اس مہربان مسکراہٹ کے پیچھے کتنے غم چھپے ہیں۔ آپا مجھے علم حاصل کرنے کی تلقین کرتیں۔ وہ کہتیں :

"ہر انسان کو علم حاصل کرنا چاہئے کیوں کہ علم وہ روشنی ہے کہ جو انسان کو اندھیروں اور گمراہیوں سے نکال کر سچائی کے اجالوں کی طرف لے جاتی ہے۔"

وہ پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سناتیں :

"علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔"

آپا مجھے انسانوں سے محبت کا درس دیتیں اور کہتیں :

"ہر انسان سے محبت کرو۔ امیر غریب سب ایک جیسے انسان ہیں۔ جو شخص اللہ کے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ اللہ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔"

میں آپا کی باتوں پر عمل کرتا۔ انسانوں سے بھی محبت کرتا اور اپنی کتابوں سے بھی۔ میں پڑھنے میں، لکھنے میں دن رات محنت کرتا اور خوب دل لگا کر پڑھتا یہی وجہ تھی کہ میں ہر سال نہ صرف اپنی کلاس میں بلکہ پورے اسکول میں اوّل آتا۔

آپا کے شوہر کو میری کامیابیوں سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ انہیں صرف اپنے کاروبار سے پیار تھا۔ انہوں نے اپنی محبت صرف ایک ہی محور پر مرکوز کردی تھی۔ شاید وہ محبت میں تقسیم کے قائل نہ تھے۔ شاید وہ سوچتے ہوں کہ محبت تقسیم ہونے سے کم ہوجائے گی لیکن اگر وہ غور و فکر کرتے تو انہیں پتا چل جاتا کہ محبت تقسیم ہونے سے کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے اور یہ تو ہوتی ہی دوسروں کو دینے کے لئے ہے۔ آپا کے خیال میں ایثار و قربانی کا دوسرا نام محبت تھا۔

وقت کا پہیہ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں کالج میں آگیا تھا۔ آپا میری کامیابیوں پر بہت خوش تھیں۔ انہوں نے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے دل لگا کر محنت کی اور کامیابی نے ہمیشہ میرے قدم چومے۔

یوں تو میں نے سب سے محبت کی لیکن سب سے زیادہ محبت مجھے اپنی آپا سے تھی اور اس کے بعد ان کے تین پیارے پیارے بچوں سے جو مجھے ماموں کہہ کر نہ تھکتے تھے۔ یہ سلیم، فائزہ اور آمنہ تھے۔

کالج سے آنے کے بعد میں سلیم' فائزہ اور آمنہ کے ساتھ کھیلا کرتا۔ انہیں بھی میرا شدت سے انتظار رہتا۔ ان کے ساتھ کھیلتے ہوئے میں بھی ان میں بچہ بن جاتا۔ آپا اپنے بچوں کے ساتھ مجھے کھیلتا دیکھتیں تو بے حد خوش ہوتیں۔

ان چند سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا' لیکن دولھا بھائی کی روش اپنی جگہ قائم تھی۔ ان کی محبت صرف اپنے کاروبار کے لئے وقف ہوگئی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔ ان کا کاروبار بڑھتا جارہا تھا۔ ان کی مصروفیت بڑھتی جارہی تھی۔ اب تو وہ گھر بھی بہت کم آتے کیوں کہ ان کے کاروبار کا دائرہ کار بیرونی ممالک تک پھیل چکا تھا اور انہیں اب کاروبار کے سلسلے میں بیرونی ممالک کے سفر کرنا پڑتے۔

اب آپا میں بھی بہت تبدیلی آگئی تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بے حد کم زور ہوگئی تھیں۔ اور بیمار رہنے لگی تھیں۔ انہیں کھانسی کی شکایت پہلے سے تھی۔ بعد میں یہ شکایت اور بڑھ گئی۔ ہروقت وہ ہولے ہولے کھانستی رہتیں۔

ایک دن جب میں انہیں ضد کر کے شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو ڈاکٹر نے چُپ چاپ مجھے بتایا آپا کو ٹی۔بی ہے' اور یہ آخری اسٹیج پر ہے۔

"آپ اگر اپنی آپا کو بچانا چاہتے ہیں تو انہیں ہسپتال میں داخل کردیں۔ ان کا مکمل توجہ اور پرہیز کے ساتھ علاج کیا جائے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

آپا ہسپتال میں داخل ہونے پر تیار نہ تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی بیماری نہیں لیکن میں اب آپا کی کوئی بات سُننے کے لئے تیار نہ تھا۔ انہوں نے چپکے چپکے اپنے سینے میں جو غم پال لیا تھا اس نے بڑھ کر ٹی۔بی کی مہلک شکل اختیار کرلی تھی۔ میں آپا کو جلد از جلد صحت یاب دیکھنا چاہتا تھا۔ ان کے منع کرنے کے باوجود میں نے انہیں ہسپتال میں داخل کرادیا۔ جلد ہی ان کا علاج شروع ہوگیا۔

آپا کے ہسپتال داخل ہوجانے سے میری مصروفیات بھی بڑھ گئیں۔ پہلے میں صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد کالج چلا جاتا تھا لیکن اب ایسا ممکن نہ رہا۔ اب سب سے پہلے مجھے آپا کے تینوں بچوں کو اسکول چھوڑنا پڑتا۔ انہیں اسکول سے خود لاتا۔ لا تو ڈرائیور بھی سکتا تھا لیکن میں بچوں کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ اب گھر کا کوئی فرد انہیں لینے نہیں آئے گا۔

اس سے پہلے بچوں کو آپا اسکول سے لے کر آتی تھیں۔ اب یہ ذمّہ داری میں نے سنبھال

لی۔ بچوں کے کھانے پینے اور ان کے ہوم ورک کا بھی میں خیال رکھتا۔ نوکروں کو خود ہی ہدایات جاری کرتا۔ باربار ہسپتال کے چکر لگاتا۔ آپا کا پرہیزی کھانا اپنی نگرانی میں پکواتا۔ وقت مقررہ پر انہیں خود دوا پلاتا۔ ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے پھل خود کاٹ کر اپنے ہاتھوں سے آپا کو کھلاتا۔ حالانکہ آپا کی خدمت گزاری کے لئے میں نے ایک مستعد نرس کا الگ سے انتظام کیا تھا۔

کالج سے میں نے چھٹی لے لی تھی۔ کیوں کہ کالج جانا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ پرنسپل صاحب کو میں نے ساری بات بتادی تھی اور انہوں نے خوشی سے مجھے چھٹی دے دی تھی۔

شام کو میں تینوں بچوں کو تیار کرا کے ہسپتال لے جاتا۔ آپا کا چہرہ اپنے بچوں کو دیکھ کر کھل اُٹھتا۔ میں آپا کو تن درست اور خوش و خُرّم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے ان کے آرام و سکون اور علاج و معالجے پر میں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔

دولھا بھائی گھر آتے تو ہسپتال اور گھر کے خرچ کے لئے پیسے دے کر چلے جاتے اور مجھ سے آپا کی خیریت وغیرہ پوچھ لیتے۔ ایک دو دفعہ وہ آپا کو دیکھنے ہسپتال بھی آئے لیکن تھوڑی دیر کے لئے اور جتنی دیر وہ آپا کے پاس بیٹھے اتنی دیر بار بار گھڑی دیکھتے رہے کیوں کہ ان کی فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔ جاپان میں انہیں اپنی کاروباری میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔

دولھا بھائی دو دفعہ ہسپتال آئے تو آپا یہی سوچتی رہیں کہ شاید ان کے شوہر ان کی بیماری پر دُکھ کا اظہار کریں گے۔ زیادہ دیر ان کے پاس بیٹھیں گے ان کی دل جوئی کریں گے انہیں حوصلہ دیں گے لیکن آپا کا خیال حقیقت نہ بن سکا۔ ان کے شوہر جتنی دیر ان کے پاس بیٹھے اپنے کاروبار کی باتیں کرتے رہے۔ آپا سے پیار و محبت کی کوئی بات انہوں نے نہ کی۔

دن بڑی تیزی کے ساتھ گزرتے جارہے تھے۔ آپا صحت یاب ہونے کے بجائے دن بہ دن کم زور ہوتی جارہی تھیں۔ ان کے دونوں پھیپھڑے ٹی۔ بی کا شکار ہو چکے تھے۔ ہر وقت وہ سوچتی رہتیں اور کھانستی رہتیں۔ ڈاکٹر بڑی توجہ اور محنت سے ان کا علاج کر رہے تھے، لیکن آپا کے درد کا علاج ان کے پاس نہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس منزل کی طرف بڑھ رہی تھیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ آخر ایک دن وہ خاموشی کے ساتھ دُنیا کو چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلی گئیں۔ آخری وقت میں بھی ان کی نگاہیں کمرے کے دروازے کی طرف لگی رہیں کیوں کہ دولھا بھائی نے آنے کو کہا تھا۔ لیکن اچانک ہی انہیں کاروبار کے سلسلے میں پہلے

جرمنی اور پھر فرانس جانا پڑگیا۔ اب کم از کم ڈیڑھ دو ہفتوں تک ان کی واپسی کی اُمید نہ تھی۔ جب وہ واپس آئے تو آپا کو کھو چکے تھے۔

بہت پہلے جب امی ابو کے مرنے کی خبر آئی تھی تو میں بہت رویا تھا لیکن جب آپا کا انتقال ہوا تو میں اس سے بھی زیادہ رویا۔ وہ میری بہن ہی نہیں میری ماں بھی تھیں۔ انہوں نے میرے ٹوٹے کھلونے جوڑے تھے اس وقت جب کہ میں ٹوٹ رہا تھا بکھر رہا تھا انہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹا تھا۔ لیکن اب وہ مجھے اور اپنے معصوم بچوں کو تنہا چھوڑ گئی تھیں۔

آپا کے بچھڑنے کا مجھے اور بچوں کو بے حد صدمہ ہوا تھا۔ کئی روز تک تو میں خود اس صدمے سے نڈھال رہا لیکن پھر اپنے معصوم بھانجے اور بھانجیوں کی خاطر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ہر وقت میں ان کی دل جوئی ہی میں لگا رہتا۔ انہیں خوش و خُرّم رکھنے کی فکر کرتا رہتا۔ لیکن آپا کی موت کے بعد تینوں بچوں کی شوخی و شرارت نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھی۔ وہ خاموش خاموش رہنے لگے تھے۔ میں ہی انہیں ہنسانے اور خوش رکھنے کی تدبیریں کرتا رہتا۔ تینوں بے حد حسّاس تھے۔

میں نے اگرچہ تینوں بچوں کو سنبھال لیا تھا' لیکن میں انہیں ماں باپ کا پیار نہیں دے سکتا تھا۔ دولھا بھائی نے آپا کی موت کے چند ماہ بعد ہی دوسری شادی کرلی اور نئی ماں نے آتے ہی بچوں کے ساتھ روایتی سوتیلی ماؤں جیسا سلوک شروع کردیا تھا۔ جب میں گھر میں ہوتا سوتیلی ماں کا رویّہ بچّوں کے ساتھ ٹھیک رہتا لیکن جیسے ہی میں گھر سے باہر جاتا ان کا رویہ بدل جاتا۔ سلیم اور فائزہ تو مجھے کچھ نہ بتاتے لیکن آمنہ میرے پیچھے ہونے والی ایک ایک بات مجھے سُنا دیتی۔

دولھا بھائی کو سلیم' فائزہ اور آمنہ کی کوئی فکر نہ تھی۔ نئی شادی کے بعد بھی وہ اپنے کاروبار میں اُلجھے ہوئے تھے۔

بہت سارے دن بڑے تکلیف دہ انداز میں گزر گئے۔ گھر پر مکمل طور پر دولھا بھائی کی نئی بیوی کا کنٹرول تھا۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب وہ مجھے اپنی راہ کا کانٹا سمجھنے لگی تھیں کیوں کہ آپا مرتے وقت مجھے اپنی جائیداد کا آدھا وارث بنا گئی تھیں۔

دولھا بھائی جب بھی گھر آتے سوتیلی ماں ان کے کان بھرنے لگتی۔ شروع شروع میں تو دولھا بھائی نے ان کی باتوں پر دھیان نہ دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے بچوں کو میری ضرورت ہے لیکن آہستہ آہستہ ان کا بھی رویّہ بدلنے لگا۔ پہلے تو کبھی انہوں نے مجھے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا لیکن

اب وہ اپنی نئی بیگم کی باتوں میں آکر مجھے بُرا بھلا کہنے لگے۔ ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ دولھا بھائی نے سوتیلی ماں کے کہنے میں آکر میرے ایک تھپڑ رسید کردیا۔ مجھے ان سے یہ اُمید نہ تھی۔ میرا دل ان کی اس حرکت پر ٹوٹ گیا بالکل اسی طرح جب بہت پہلے میرے کھلونے ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن اس وقت تو آپا نے مجھے اپنے کلیجے سے لگا کر میرا دل جوڑ دیا تھا۔

دولھا بھائی کا رویہ اور سوتیلی ماں کا سلوک دن بہ دن' ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔ میں صرف بچوں کی وجہ سے گھر میں رُکا ہوا تھا ورنہ کب کا چلا گیا ہوتا۔ میں سلیم' فائزہ اور آمنہ کو ان کی سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

ان ہی دنوں حکومت ذہین اور اول درجوں میں کام یاب ہونے والے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک بھیج رہی تھی۔ میں نے چوں کہ تمام امتحانات میں اول پوزیشن لی تھی۔ اس لئے حکومت نے تین سال کے لئے مجھے اپنے خرچ پر امریکا بھیجنے کا فیصلہ کیا جس دن مجھے حکومت سے اس کی اطلاع ملی اس دن میرے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میرے پر لگ گئے ہوں۔ میں ابھی اُڑ کر باہر پہنچوں اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد بڑا آدمی بن کر اپنے وطن واپس آجاؤں گا۔

میرا روشن مستقبل مجھے پکار رہا تھا۔ ایک نئی صبح مجھے آواز دے رہی تھی میں سوچنے لگا کہ آخر وہ دن آہی گیا جس کی مجھے آرزو تھی۔ مجھے آپا یاد آگئیں۔ وہ بھی تو مجھے بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا کرتی تھیں۔

"کاش! آپا آج زندہ ہوتیں اور مجھے کام یابی کے راستوں کی طرف بڑھتا دیکھتیں۔"

میں حکومت کا خط ہاتھ میں تھامے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کمرے میں سلیم' فائزہ اور آمنہ داخل ہوئیں۔ تینوں اب کافی سمجھ دار ہوگئے تھے۔ سلیم نویں میں' فائزہ آٹھویں میں اور آمنہ پانچویں جماعت میں تھی۔ تینوں بچے بے حد ذہین تھے اور اپنی جماعتوں میں ہمیشہ سے اوّل آتے تھے۔

سلیم نے میرے ہاتھ میں لفافہ دیکھا تو پوچھا۔ "ماموں! کس کا خط ہے؟"

میں نے جواب دیا :

یہ خط حکومت کی طرف سے آیا ہے چوں کہ میں تمام امتحانوں میں اوّل ہوں اور میرا تعلیمی ریکارڈ ہمیشہ شان دار رہا ہے اس لئے حکومت اپنے خرچ پر اعلا تعلیم کی غرض سے مجھے امریکا بھجوا رہی ہے۔"

"تو کیا ماموں جان! آپ ہمیں چھوڑ کر چلے

جائیں گے؟" مغموم لہجے میں ننھی آمنہ نے کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ تینوں بچوں کے چہرے میرے باہر جانے کی خبر کا سُن کر اُتر گئے تھے۔

آمنہ کی نسبت سلیم اور فائزہ زیادہ سنجیدہ تھے۔ انہوں نے آمنہ کی بات سُنی تو مجھ سے کہا :

"ماموں جان! آپ ضرور باہر جائیں اعلا تعلیم حاصل کریں۔ روشن مستقبل آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

یہ بات انہوں نے بڑے حوصلے سے کہی تھی لیکن ان کا لہجہ چُغلی کھا رہا تھا کہ میرے باہر جانے کی خبر سن کر وہ بھی اداس ہو گئے تھے۔ میں ہی تو ان کا ایک سہارا تھا۔ میرے ہی سائے میں وہ سکون و محبّت ڈھونڈتے تھے۔

میں سوچنے لگا اگر میں باہر چلا گیا تو سوتیلی ماں نہ جانے میری بہن کے ان معصوم بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اب تو میری وجہ سے وہ ذرا دبی رہتی ہے۔

"تو کیا تم امریکا نہیں جاؤ گے؟ میرے دل نے مجھ سے سوال کیا۔ کیا تمہیں اپنا مستقبل عزیز نہیں؟ ایسا سنہری موقع پھر کہاں ملے گا!"

پھر مجھے وہ دن یاد آگیا جب امی ابو مجھے چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے تھے اور میرے کھلونے ٹوٹ گئے تھے۔ ایسے مشکل وقت میں آپا ہی نے مجھے اپنے کلیجے سے لگا کر میرے کھلونے جوڑے تھے۔ میں نے حکومت کے بھیجے ہوئے خط کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

"یہ کیا کیا ماموں جان آپ نے؟" تینوں بچّے ایک ساتھ بولے۔ "محبّت قربانی مانگتی ہے۔ ایثار و قربانی کا دوسرا نام محبّت ہے۔"

آہستہ سے میرے لب ہلے۔ آپا کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ بہت پہلے انہوں نے مجھے ٹوٹنے سے بچا کر مجھ پر ایک عظیم احسان کیا تھا۔ آج مجھے قربانی دے کر ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو بچانا تھا۔

میں نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

تینوں بچے دوڑ کر میرے بازوؤں میں سما گئے۔ میں نے اپنے دل کے ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو سنبھالتے ہوئے مضبوط و مستحکم لہجے میں کہا :

"میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا" میں نے ننھی آمنہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔"

لرزتے کانپتے چند ستارے میری پلکوں سے ٹوٹے اور چپکے سے آمنہ کے سر کے گھنے بالوں میں کہیں گم ہو گئے۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو بچّوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

بچّوں کی ہنسی کو بجھنے نہ دو

محمد جاوید خالد

بچّوں نے سجایا دُنیا کو
تم جیسے ہو، تم کوئی بھی ہو
خود یاد رکھو، اوروں سے کہو
بچوں کی ہنسی کو نہ بُجھنے دو
بچّوں کی ہنسی کو نہ بُجھنے دو

فطرت کے خزانے میں لوگو
ہر ایک زمانے میں لوگو
ہر سُننے، سُنانے میں لوگو
کوئی شے نہیں اس سے بڑھ کر تو
بچّوں کی ہنسی کو نہ بُجھنے دو

اللہ کرم فرماتا ہے
فطرت کے راز سکھاتا ہے
جو بچّہ لے کر آتا ہے
گر سیکھنا ہے ان رازوں کو
بچّوں کی ہنسی کو نہ بُجھنے دو

مانا کہ بشر سے خطا بھی ہے
مانا کہ خطا پہ سزا بھی ہے
مانا کہ سزا یہ بجا بھی ہے
معصوم کو تو پر کچھ نہ کہو
بچّوں کی ہنسی کو نہ بُجھنے دو

یہ تیرے ہیں، یا میرے ہیں
یہ روشن، اُجلے سویرے ہیں
اور ان کے بعد اندھیرے ہیں
گر روشنی چاہتے ہو تو سُنو
بچّوں کی ہنسی کو نہ بُجھنے دو

نیئر ہما

یہ مظلوم بچے

دُنیا میں بچوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے

کوئی بچہ جب دنیا میں وارد ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ گورا ہے یا کالا ترقی یافتہ قوم کا فرد ہے یا کسی پسماندہ علاقے کا باسی، وہ آزاد ہے یا محکوم وہ تو صرف اور صرف ایک ایسا معصوم وجود ہوتا ہے جسے سرحدی تنازعات و نسلی لسانی تعصبات، علاقائی بٹواروں، لین دین کے گوشواروں، اونچ نیچ کی دیواروں کا کوئی علم نہیں ہوتا وہ صرف ایک بچہ ہوتا ہے جسے دنیا میں آنے کے بعد محبت و شفقت، خوراک و تعلیم علاج، امن اور تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن حضرتِ انسان اپنی آنے والی نسلوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ ان کے مناظر دیکھ کر روح کانپ اُٹھتی ہے اور انسانیت کے لفظ سے اعتبار اُٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آج دنیا کے بچّے کس طرح انسانی وحشت و بربریت کی وجہ سے بھوکے پیاسے ہیں۔ ننگ دھڑنگ موسموں کی سختیاں

سہہ رہے ہیں۔ علاج کو ترستے ترستے مختلف بیماریوں سے سسک سسک کر مر رہے ہیں اور عدم تحفظ کا شکار ہو کر کیڑے، مکوڑوں کی طرح جی رہے ہیں۔ برستی گولیاں اور بموں کے دھماکے ان سے ماؤں کی گود چھین رہے ہیں، باپوں کی شفقت سے محروم کر رہے ہیں اور وہ روٹی تو روٹی پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے ہیں۔

لہو لہو وادی کشمیر کے بچے، بلکتے ہوئے بوسنیا کے یتیم بے آسرا فلسطینی ننھے فرشتے، سہمے سہمے افغانی معصوم اور روانڈا کے بے خانماں بے آسرا بچے ایک ہی جیسے بے قصور ہیں۔ جو کچھ انسان کی بے حسی اور لامتناہی ہوس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ روانڈا کی حالیہ خانہ جنگی میں سیاہ فام بچے جس طرح تباہی و بربادی کا شکار ہوئے ہیں وہ ترقی یافتہ قوموں کے لئے یقیناً "سوچنے کا مقام ہے!

ادارہ یونیسف نے اپنی سالانہ رپورٹ ۱۹۹۵ء میں بتایا ہے کہ گزشتہ عشرے میں جنگوں کے باعث بیس لاکھ بچے ہلاک ہوئے، ۴۵ لاکھ معذور اور ایک کروڑ بیس لاکھ بے گھر ہوئے، دس لاکھ سے زائد بچے یتیم ہو گئے یا والدین سے جُدا کر دیئے گئے اور تقریباً" ایک کروڑ بچے تشدد کی وجہ سے نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوئے جو بچے محفوظ رہے، زندگی بھر امن کے متلاشی رہیں گے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کو جان بوجھ کر نشانہ بنانے کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔ انہیں فوجی مقاصد و سیاسی اغراض اور شہریوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ دنیا میں بڑھتے ہوئے جنگی علاقوں کی وجہ سے بچوں کے تحفظ اور دیکھ بھال کے حقوق کو روندا جا رہا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ حالیہ تصادموں کا ایک انتہائی پریشان کُن پہلو بچوں کا فوجیوں کی حیثیت سے استعمال ہے۔ حال ہی میں پچیس ملکوں میں سولہ سال سے کم عمر لڑکوں و لڑکیوں نے ان تصادموں میں یا تو فوج کے مددگار یا لڑاکا حیثیت سے حصہ لیا۔ یونیسف نے اس رجحان کی مذمت کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا کہ بچوں کے حقوق کنونشن کے لئے اسپیشل پروٹوکول اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ فوج میں بھرتی کی کم سے کم عمر پندرہ سال سے بڑھا کر اٹھارہ کر دی جائے۔ جنگ کی ایک اور لعنت بارودی سرنگیں ہیں جو ہر سال ہزاروں بچوں کو ہلاک یا ان کے جسموں کو زخمی کر دیتی ہیں۔ یونیسف نے سرنگوں کے متعلق سخت موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ممالک ہتھیاروں کو تیار کرنے، ان کی فروخت و ذخیرہ اندوزی اور برآمد پر پابندی لگانے کے لئے بین الاقوامی قانون بنایا جائے گا۔ آج کے جنگجو گروپ بچوں کو فوج میں بھرتی کرنے اور زمینی سرنگیں بچھانے کے علاوہ

چونکہ یہ روز کا واقعہ ہے اس لئے یہ خبر نہیں ہے۔

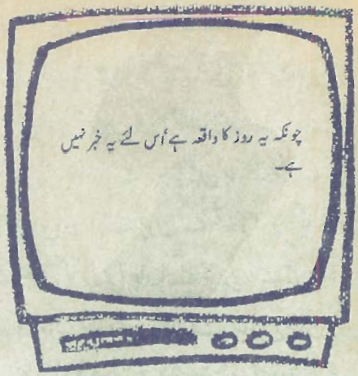

دنیا کی سب سے بڑی تباہی بالعموم ہمارے ٹیلی ویژن اسکرین پر دکھائی نہیں دیتی۔

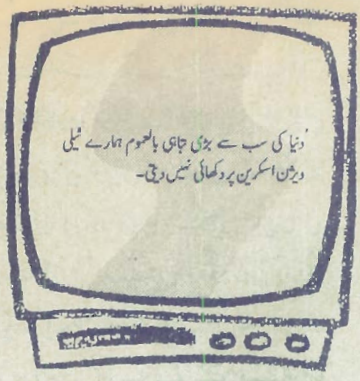

عدم غذائیت اور بیماری سے ہر ہفتہ اتنے ہی بچے مر جاتے ہیں اور مزید لاکھوں بچوں کی نشوونما رک جاتی ہے۔

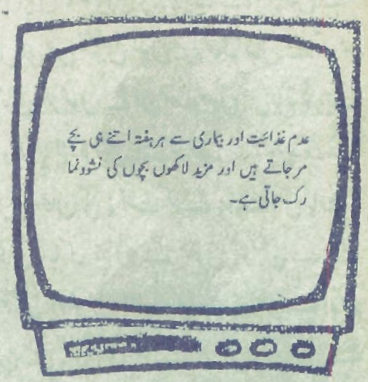

لیکن کسی بھی قحط کسی بھی سیلاب اور کسی بھی جنگ میں ہر ہفتہ دُھائی لاکھ بچے مارے گئے۔

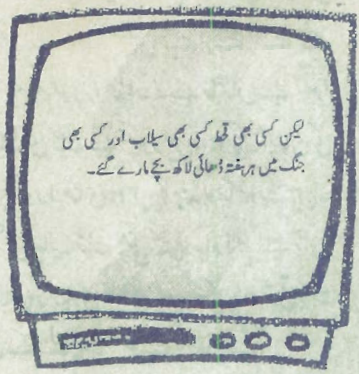

دنیا بھر میں غریب گھرانوں میں بچوں کا عدم غذائیت اور بیماری میں مبتلا ہونا معمول بن چکا ہے۔

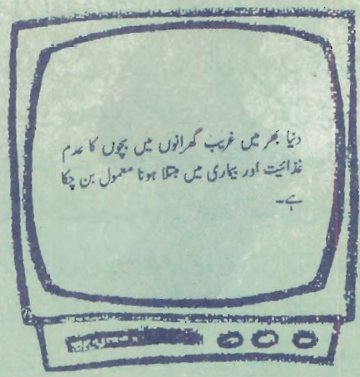

آج کی معلومات کی وجہ سے اب اس المیہ کی ضرورت نہیں اس لئے اب اس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

(یونیسف)

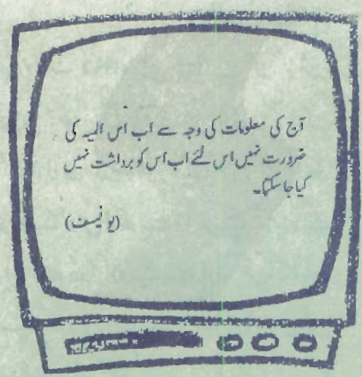

ہسپتالوں، واسکولوں کو پانی کی فراہمی کے انتظامات اور اناج پیدا کرنے والے علاقوں کو بھی نقصان پہنچا کر شہری آبادی کو نشانہ بناتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بموں اور گولوں سے مرنے والے بچّوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعداد میں بچّے ناقص غذا اور بیماری سے مرجاتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے ایک مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ یوگنڈا کے جنگ کے ایک علاقہ میں ۷۸ فیصد اموات بھوک سے ہوئیں۔ مختلف بیماریوں سے بیس فیصد جبکہ تشدد سے صرف دو فیصد اموات ہوئیں۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۸ء کی درمیانی مدت میں خوراک اور صحت کی سہولتوں کی کمی کی وجہ سے انگولا میں تین لاکھ ۳۳ ہزار بچّے ہلاک ہوئے اور موزمبیق میں چار لاکھ نوے ہزار۔ موزمبیق کے چالیس مراکز صحت تباہ ہوئے اور ملک کے بیس لاکھ بچّوں میں سے دو تہائی بچّوں کے لئے کوئی کلاس روم باقی نہیں۔

آج جنگوں کی وجہ سے پانچ کروڑ تیس لاکھ افراد بے گھر ہوچکے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ برسوں کی جنگ کے دوران جو ہتھیار استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے چند ایسے ہیں جن کی تیاری ہر زمانہ میں جاری رہی ہے اور جو بچّوں کے لئے مہلک ہیں ۶۴ ملکوں میں جہاں گیارہ کروڑ بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں، بچّے مویشی ہانکتے ہوئے یا کھیتوں میں کام کرتے ہوئے یا کھیلتے ہوئے ان کو اٹھا لیتے ہیں یا ان کا پاؤں ان پر پڑجاتا ہے۔ چونکہ بہت سی سرنگوں کی شکلیں کھلونوں یعنی لٹوؤں، انّاس یا تتلیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ بعض علاقوں میں بچّے ان کو اسکریپ سمجھ کرلے جاتے ہیں۔ ساری دنیا میں اپاہج اور اندھے بچّے ان بارودی سرنگوں کی تباہی کے گواہ ہیں۔ ۱۹۷۵ء سے ان سرنگوں نے دس لاکھ سے زائد افراد کو ہلاک کیا یا ان کے جسموں کو مسخ کیا۔ یہ سرنگیں ہر ماہ ۸۰۰ افراد کو ہلاک اور ایک ہزار سے زائد افراد کو اپاہج بنادیتی ہیں۔ انگولا میں دس ہزار افراد اپنے اعضا سے محروم ہوچکے ہیں جن میں سے بیشتر تعداد بچّوں کی ہے!!

اقوال زریں

شیخ سعدیؒ : دنیا میں وہی لوگ سربلند رہتے ہیں جو غرور کے تاج کو دور پھینک دیتے ہیں۔

خوشحال خان خٹکؒ : مجھے اس آزاد انسان کی زندگی پر رشک آتا ہے جو دولت اور زمین کے بغیر خوش رہتا ہے۔

ایمرسن : خون کی ندیاں بہانے سے وہ شہرت حاصل نہیں ہوتی جو صرف اکیلا ایک آنسو پونچھ دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

مرسلہ ... عائشہ عباسی

کس جرم میں مارا گیا

محمد عمر احمد خان

ایک سال پیچھے چلتے ہیں.....!!

۲۸ مئی بروز اتوار کا دن ہے' سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ ایک گاڑی کافی دیر سے اِدھر.... اُدھر چکر کاٹ رہی ہے۔ اس میں ایک باپ ایک ماں سوار ہے۔ انہیں اپنے اکلوتے بچے کی تلاش ہے۔ جو تین گھنٹے گزرنے کے بعد بھی اسکول سے گھر نہیں پہنچا ہے۔ والدین کی آنکھوں کا نُور اچانک ان سے دُور ہو گیا ہے..... یہ زمان ٹاؤن کورنگی کا علاقہ ہے۔ ایک خالی پلاٹ کے پاس لوگوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ باپ گاڑی وہاں روکتا ہے اور بے قرار ہو جاتا ہے' ماں بے چین ہو جاتی ہے۔ وہ دل کو بہلاتی ہے کہ کسی اور بچے کی لاش ہو گی کیوں کہ اس خونی شہر میں جہاں آسیب کا سایہ ہے روز درجنوں بچے مر جاتے ہیں لیکن جب ماں باپ اندر جاتے ہیں تو ایک قیامت کا منظر ان کا منتظر ہے۔ ان کا لختِ جگر نُور نظر فہد مُردہ حالت میں کپڑے کی گٹھریوں کے درمیان دبا پڑا ہے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہے۔ گلا کٹا ہوا ہے دونوں ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہیں' ماں کا دل پھٹا جا رہا ہے۔ آنسو گالوں پر بہہ رہے ہیں۔ دوڑ کر اپنے لختِ جگر کو دیکھتی ہے' ٹٹولتی ہے' فہد مر چکا ہے اسے مرے ہوئے بھی تین گھنٹے ہو چکے ہیں باپ کی صدمے سے بُری حالت ہے' لوگ افسوس کر رہے ہیں ماں اپنے ہاتھوں سے فہد کے منہ سے کپڑا نکالتی ہے اس کے پیچھے بندھے ہاتھوں کی رسیاں کھولتی ہے' نامعلوم قاتلوں نے بارہ گرہیں لگائی ہیں وہ گنتی ہے پھر بڑی ہمّت سے بچے کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھرتی ہے۔ نویں جماعت کا صحت مند بچہ فہد ماں کے بازوؤں میں اپنے بے جان وجود کے ساتھ لٹک جاتا ہے..... چمکدار چہرے اور پُر عزم آنکھوں والا فہد اسٹینڈرڈ ہائی اسکول کورنگی کا ذہین ترین طالب علم تھا۔ وہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی اور والدین کی آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ ایک باتمیز بچہ تھا۔ ہنس مکھ' ملنسار' بڑوں کا ادب کرنے اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنے والا۔ سب لوگ اس سے بے حد خوش تھے۔ لیکن اب خوشیاں روٹھ گئی ہیں۔ والدین کی آنکھوں کا تارا ڈوب گیا ہے..... آج پورا ایک سال گزرنے کے بعد بھی اس کے نامعلوم قاتلوں کا کوئی پتہ نہیں..... اس کے مظلوم والدین کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں ..... حکومت آہنی ہاتھ کا راگ الاپتی رہتی ہے لیکن یہ آہنی ہاتھ صرف وزیراعظم' صدر اور وزیروں' مشیروں کی حفاظت کے لئے ہے' غریبوں اور معصوم عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لئے تو صرف اللہ کا ہاتھ ہے جو ایک دن ظالموں سے ان کے ایک ایک ظلم کا حساب لے گا تب معصوم فہد کو بھی پتہ چل جائے گا کہ اسے کس جُرم میں مارا گیا.....!!

ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بچہ کتنا پیارا۔ (فہد جب ایک سال کے تھے)۔

تتلیاں پکڑتے ہوئے کیا معلوم تھا کہ موت ایک دن پیچھے
سے مجھے آپکڑے گی!!

بھیا! ہمارا تمہارا ساتھ بس اِتنے دِنوں کا تھا! (فہد، صدف اور
چچازاد بھائی کے ہمراہ، فہد اس وقت نو سال کے تھے)

فہد اپنے ابّو عابد صاحب، بڑی بہن صدف اور انڈیا سے آئی ہوئی تایازاد بہنوں کے ہمراہ

فہد اپنی امی، بہن صدف اور کزنز کے ہمراہ...
اسی عمر میں نامعلوم قاتلوں کے ظلم کا نشانہ بنے!

ایک بدنصیب بچے کا خط

محمد علی انصاری

مجھے اک گلی میں پڑا ہوا کسی بدنصیب کا خط ملا
کہیں خونِ دل سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

پیارے ابو جان، السلام علیکم

امید ہے کہ بخیریت ہوں گے یہ خط میں امی جان سے چھپ کر لکھ رہا ہوں۔ نہ جانے کیوں امی مجھے آپ کو خط لکھنے نہیں دیتیں۔ ابو اب میں بڑا ہوگیا ہوں اور مجھے لکھنا بھی خوب آگیا ہے۔ جس کا ثبوت میرا یہ خط ہے۔ مجھے وہ دن بہت یاد آتے ہیں جب آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے لکھنا سکھاتے۔ ٹیچرز میری ہینڈ رائٹنگ کی بہت تعریف کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔ ابو آپ کب آئیں گے جلد از جلد جواب دیں۔ مجھے آپ سے آج بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ آپ کو گئے ہوئے پانچ ہوگئے

ہیں جب آپ گئے تھے تو میں پانچ سال کا تھا اور اب میں پورے دس سال کا ہوگیا ہوں۔ مجھے اچھی یاد ہے کہ جب آپ مجھے اور صائمہ باجی کو سائیکل پر اسکول چھوڑنے جاتے تھے۔ ابو جب مجھے وہ خوبصورت دن یاد آتے ہیں تو آپ کی یاد مجھے بے چین کردیتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کسی بھی طرح اُڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ صائمہ باجی اب کالج جانے لگی ہیں۔ بہت بور اور چڑچڑی ہوگئی ہیں۔ اکثر مجھے ڈانٹ دیتی ہیں۔ لیکن مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی ہیں اتنا کہ آپ کے جانے کے بعد اپنے سارے کھلونے انہوں نے مجھے دے دیئے تھے۔ لیکن مجھے کھلونوں سے کھیلنا اچھا نہیں لگتا۔ میں بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔ آپ بھی تو یہی چاہتے ہیں نا۔ اب میں بہت محنت کررہا ہوں۔ میں نے کھیلنا کودنا سب بند کردیا ہے۔ ہاں البتہ کبھی کبھی صائمہ باجی کے ساتھ کیرم کھیل لیتا ہوں اور کھیل میں کبھی نہیں ہارتا حالانکہ صائمہ باجی کو مجھ سے اچھا کیرم کھیلنا آتا ہے۔ دراصل وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ میری شکست انہیں اچھی نہیں لگتی اور جب میں انہیں ہرا کر خوب ہنس ہنس کر تالیاں بجاتا ہوں تو وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر خوب پیار کرتی ہیں۔ لیکن پڑھائی کے معاملے میں ان کا پیار جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ پڑھائی پر بہت مار لگاتی ہیں۔ کالج سے آنے کے بعد وہ بہت تھک جاتی ہیں۔ لیکن جب میرا ہوم ورک کرانا ہو تو ساری تھکن رفو چکر ہوجاتی ہے اور وہ فریش لگنے لگتی ہیں۔ ان کا پیار اور غصہ دونوں ہی مجھے بہت خوبصورت لگتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ابھی تک امی کا تذکرہ کیوں نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امی کے ساتھ میرا بہت کم واسطہ رہ گیا ہے صرف اتنا کہ اگر مشین کی سوئی میں دھاگہ پرونا ہو تو وہ مجھے آواز دے لیتی ہیں۔ ہر وقت وہ محلے والوں کے کپڑے سیتی رہتی ہیں اور اگر کبھی آپ کے بارے میں سوال کرلوں تو جھڑک دیتی ہیں۔ اگرچہ امی کو مجھ سے محبت کرنے کی فرصت نہیں لیکن میں ان سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی آپ سے۔ صائمہ باجی پہلے مجھ سے آپ کی ڈھیر ساری باتیں کیا کرتی تھیں لیکن جب سے وہ کالج جانے لگی ہیں امی کی طرح ہوگئی ہیں۔ آپ کا تذکرہ انہیں بھی ناگوار گزرتا ہے۔ شاید امی اور صائمہ باجی آپ کو بھول جانا چاہتی ہیں۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا! لیکن ابو میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ آپ کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک پل میرے ذہن پر نقش ہے۔ آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ ایک اہم بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا اور وہ یہ ہے کہ اس مرتبہ بھی میں نے

اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لی ہے۔ جس دن میں رپورٹ کارڈ لے کر گھر پہنچا تھا تو صائمہ باجی کالج سے نہیں آئی تھیں۔ جب میں نے امی کو یہ خبر سنائی تھی تو انہوں نے ہمیشہ کی طرح میرا ماتھا چوم کر مجھے سینے سے لگا لیا تھا۔ لیکن اس دفعہ پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا تھا کہ امی کتنی کمزور ہوگئی ہیں۔ ان کی گرتی ہوئی صحت نے انہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنادیا ہے۔ ابو یہ بات لکھتے ہوئے میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی ہے۔ امی کی آنکھیں بھی بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ اس لئے مشین کی سوئی میں دھاگہ میں ہی پرو کر دیتا ہوں۔ صائمہ باجی کئی مرتبہ امی سے آنکھیں ٹیسٹ کروانے اور عینک بنوانے کے لئے کہتی رہتی ہیں لیکن امی کا یہی جواب ہوتا ہے کہ جب پیسے آئیں گے تو بنوالوں گی۔ لیکن پیسے نہیں آتے۔ حالانکہ امی میرے اسکول کے ڈھیر سارے اخراجات ہر مہینے باقاعدگی سے ادا کرتی ہیں اور جب میں کہتا ہوں کہ امی اب تو پیسے آگئے ہیں تو میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں لیکن کہتی کچھ نہیں۔ اسی وجہ سے میں نے امی سے سوالات کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ابو آخر آپ بہت سارے پیسے کب بھیجیں گے۔ جب آپ گئے تھے تو صائمہ باجی اور میں آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں کیا کرتے تھے۔ صائمہ باجی کہتی تھیں کہ ابو تمہارے لئے بہت سارے کھلونے اور بہت سارے پیسے لینے کے لئے ملک سے باہر گئے ہیں اور جب ابو بہت سارے پیسے لے کر آئیں گے تو ہم یہ جھونپڑی نما مکان چھوڑ کر ایک خوبصورت سا اور بڑا سا مکان لیں گے اور بھی نہ جانے کیا کیا باتیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن اب لگتا ہے جیسے وہ آپ کو بالکل بھول گئی ہیں۔ آپ کو گئے ہوئے بھی تو اتنا عرصہ ہوگیا ہے۔ ابو آپ جلدی سے کیوں نہیں آجاتے۔ اگر آپ آجائیں گے تو میں صائمہ باجی اور امی کو منالوں گا جو آپ سے بلا وجہ ناراض ہوگئی ہیں۔ پھر ہم ایک خوبصورت سا گھر بنائیں گے۔ مجھے اگرچہ یہ بُرا تو نہیں لگتا لیکن بارش کے دنوں میں یہ جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور پھر جب میں اپنے دوستوں کے گھروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے شدید احساسِ کمتری محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ اس گھر سے آپ کی یادیں وابستہ ہیں اس لئے مجھے یہ گھر بُرا نہیں لگتا۔ لیکن جب آپ آجائیں گے تو ہم نیا گھر ضرور بنوائیں گے اور اس میں ایک چھوٹا سا باغ بھی بنوائیں گے۔ جیسا میرے دوست باسط کے گھر میں ہے۔ انہوں نے اپنے باغ میں پھولوں کی بہت خوبصورت کیاریاں بنا رکھی ہیں۔ گلاب، چنبیلی، گل لالہ، سدا بہار نہ جانے کیسے کیسے اور کتنے ہی انہوں نے پھول لگائے ہوئے

ہیں جن کے مجھے نام بھی نہیں آتے۔ ابو آپ کب آئیں گے؟ اگر آپ صائمہ باجی اور امی کی ناراضگی کی وجہ سے نہیں آتے تو نہ آئیں لیکن میرے لئے تو آجائیں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اگر آپ جلدی نہ آئے تو میں آپ سے ناراض ہوجاؤں گا۔ لیکن صرف ناراض ہوجانے سے آپ کو دیکھنے کی شدید خواہش کم تو نہیں پڑجائے گی۔ امی اور صائمہ باجی بھی آپ کو بھول تو نہیں سکتیں۔ باجی مجھے تو آپ کے بارے میں سوال کرنے سے منع کرتی ہیں لیکن خود امی سے آپ کے بارے میں پوچھتی رہتی ہیں اور امی جواب بھی دیتی ہیں جو میری سمجھ سے بالا تر ہیں لیکن میرے سوالوں کے امی کے پاس کسی بھی قسم کے کوئی جوابات نہیں ہوتے۔ ابو وہ تمام سوالات وہ تمام باتیں جو میں امی سے نہیں کرپاتا وہ میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کی باتیں آپ ہی سے کرنا چاہتا ہوں اور نہ جانے میں کیا کیا چاہتا ہوں۔ بس آپ ایک مرتبہ کبھی نہ جانے کے لئے آجائیں۔ خط کافی طویل ہوگیا ہے۔ لیکن ابھی میری بہت سی باتیں باقی ہیں۔ لیکن صائمہ باجی کے کالج سے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔ اگر انہیں خط کے بارے میں معلوم ہوگیا تو ناراض ہوں گی۔ آپ کو معلوم ہے؟ میں یہ خط اپنے اسکول کی ایک دن کی قربانی دے کر لکھ رہا ہوں جس کے لئے میں نے سردرد کا بہانہ کیا تھا۔ حالانکہ میں کبھی بھی اسکول کا ناغہ نہیں کرتا۔ امی بازار گئی ہوئی ہیں۔ اچھا ابو اب اجازت۔ باقی باتیں آپ کے آنے کے بعد ہوں گی اور مجھے یقین ہے کہ میرا خط پڑھ کر آپ ضرور آجائیں گے۔

فقط

آپ کا پیارا بیٹا

عامر

خط پڑھ کر بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ یہ خط مجھے کل ایک جلی ہوئی چھٹی جماعت کی اُردو کی کتاب سے مِلا تھا اور یہ کتاب مجھے پرسوں رات آگ لگ جانے کی وجہ سے جل جانے والے کچے مکانوں.....

میں سے ایک جھونپڑی نما مکان جس کی پوری چھت گر گئی تھی، میں سے ملی تھی اور چھت ہٹانے پر ان تینوں ماں بیٹی اور بیٹے کی جُھلسی ہوئی لاشیں مِلی تھیں۔ ایک طرف وہ ماں تھی جس کی تمام قُربانیوں کو کسی سفاک نے ایک لمحے میں ضائع کردیا تھا دوسری طرف وہ بہن تھی کہ جس کی آنکھوں میں اپنے بھائی کو بڑا آدمی بنانے کا خواب تھا اور آج تمام محبتوں اور اُمیدوں کا مرکز ایک لاش کی صورت میں پڑا تھا جس کی تمام تمنائیں اور تمام ارمان اس کے جسم کے ساتھ جُھلس گئے تھے!!

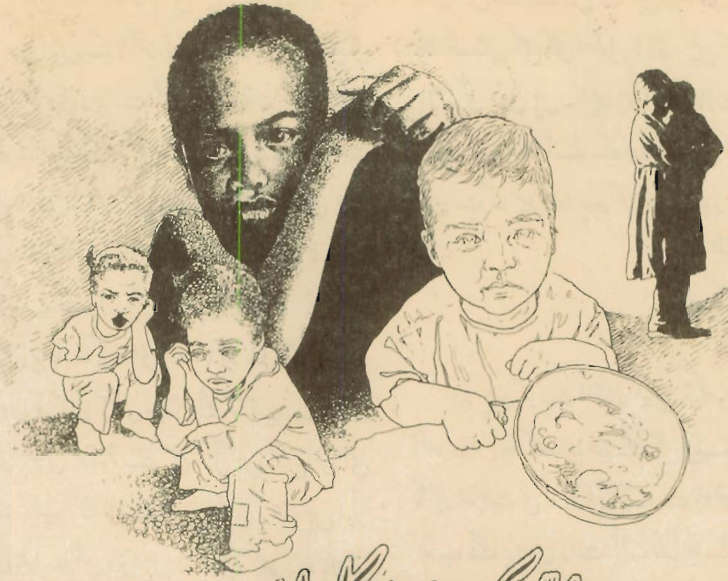

بچوں کے حقوق کا چارٹر

قاضی فضل

بچوں کے حقوق کا معاہدہ ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے منظور کیا تھا۔ اب اس معاہدہ کی حکومت پاکستان نے بھی اس شرط کے ساتھ منظوری دے دی ہے کہ ان پر اسلامی قوانین اور اقدار کے مطابق ہی عمل کیا جائے گا۔ اس بین الاقوامی معاہدے کی چند خاص خاص باتیں یہ ہیں۔

۱۔ اٹھارہ سال سے کم عمر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو بچہ مانا جائے گا۔

۲۔ بچوں کے ساتھ ان کے یا ان کے والدین اور سرپرست کے رنگ، نسل، عقیدے، مذہب، زبان، ملک، قوم، قبیلے، پیدائش کی جگہ، سیاسی رائے، رتبے، جائیداد یا کسی معذوری کی وجہ سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ بچوں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت عدالتیں، رضا کار ادارے یا سرکاری

کارکن بچے کے بہترین مفاد کو ہمیشہ سامنے رکھیں گے۔ اور ماں باپ' سرپرست یا بچوں کی دیکھ بھال کا کوئی ادارہ بچے کی مناسب دیکھ بھال نہ کرپائے تو حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ بچے کی مناسب دیکھ بھال کا انتظام کرے۔

۴۔ تمام ملک اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ معاہدے میں درج بچوں کے حقوق پر عمل درآمد کے لئے ضروری قانونی اور انتظامی کاروائی کریں۔

۵۔ ہر ملک بچوں کے ماں باپ' سرپرست اور خاندان کے اس حق' ذمہ داری اور فرض کا احترام کرے گا کہ بچے کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے اس کی مناسب تعلیم و تربیت اور رہنمائی کریں۔

۶۔ دنیا میں زندہ رہنا ہر بچے کا پیدائشی حق ہے پیدا ہونے والے ہر بچے کی جان بچائی جائے اور اس کی اچھے طریقے سے پرورش کی جائے۔

۷۔ پیدائش کے فوراً بعد بچے کا نام رکھا جائے گا۔ اسے شہریت دے دی جائے گی۔ اور اس کی پیدائش اور نام سرکاری ادارے کے پاس درج کرایا جائے گا۔ یہ جاننا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ ہر بچے کا حق ہے تاکہ وہ ان کی محبت حاصل کرسکے۔ حکومت اس بات کا خاص خیال رکھے گی کہ بچے عام حالات میں اپنے ماں باپ کی شفقت سے محروم نہ رہیں۔

۸۔ حکومت اس بات کی حفاظت کرے گی نام' شہریت اور خاندان کے حوالے سے بچوں پہچان قائم رہے اور اگر کسی وجہ سے یہ پہچان ہو جائے تو وہ اسے پھر سے جلد از جلد قائم کر کی پوری کوشش کرے گی۔ کسی وجہ سے ہوجانے والے بچوں کو ان کے گھر والوں پہنچانا حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

۹۔ حکومت اس بات کا خیال رکھے گی کہ بچہ اپنے ماں باپ سے ان کی مرضی کے بغیر نہ ہونے پائے۔ اگر کسی وجہ سے قانونی طو ایسی جدائی ضروری ہوجائے تو بچے کے بہت مفاد کو سامنے رکھا جائے گا۔ ماں باپ علیحدگی کی صورت میں بچے کا یہ حق ہے اسے دونوں سے ملنے دیا جائے چاہے اس رہائش ان میں سے کسی ایک کے پاس ہو۔ ماں باپ بچے کے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں بچے کو ان سے الگ کیا جاسکے گا۔

۱۰۔ اگر بچہ اور اس کے ماں باپ دو الگ ملکوں میں رہ رہے ہوں تو ان کو یہ حق حا ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو ملنے کے لئے ملک سے دوسرے ملک میں آجاسکیں۔ دونوں ملک انسانی بنیادوں پر خاندانوں کو ہونے کی درخواست کرنے والوں یا ان

خاندان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

۱۱۔ ہر حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ بچوں کو اغوا کرنے یا ان کو زبردستی دوسرے ملکوں میں لے جانے یا رکھنے کی ہر کوشش کو روکے اور ناکام بنائے اور اغوا ہونے والے بچوں کو واپس لایا جائے اس بارے میں دوسرے ملکوں سے بھی ضروری معاہدے کئے جائیں یا موجودہ معاہدوں میں اس بات کا اضافہ کیا جائے۔

۱۲۔ بچہ اس قابل ہوجائے کہ وہ اپنی رائے قائم کرسکے تو حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ بچہ اپنے بارے میں اپنی رائے کا پوری آزادی سے اظہار کرسکے۔ اور اس کی عمر کے لحاظ سے بچے کی رائے کو اہمیت بھی دی جائے۔

۱۳۔ ہر بچے کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہوگی۔ وہ اپنی پسند کے مطابق زبانی لکھ کر یا تصویر کے ذریعے ہر قسم کی معلومات ملک کے اندر یا باہر سے حاصل کرسکے گا اور انہیں دوسروں تک پہنچا سکے گا۔ لیکن اس بارے میں ملک کے قانون، ملک کی سلامتی، عوام کے امن، دوسروں کے حقوق اور اخلاق کا خیال رکھا جائے گا۔

۱۴۔ ہر ملک کے بچوں کو سوچنے سمجھنے، بات کہنے اور اس کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہوگی اور اسے ماں باپ کی رہنمائی اور ملک کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق ہوگا۔

۱۵۔ بچوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ دوسروں سے ملیں، کسی انجمن، میں شامل ہوجائیں یا خود کوئی انجمن بنائیں اس سلسلے میں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ دوسروں کے حق کی خلاف ورزی نہ ہو۔

۱۶۔ کسی بچے کی ذاتی زندگی، اس کے خاندان، گھر یا ذاتی خط و کتابت میں کسی طرح کی غیر قانونی مداخلت نہیں ہونے دی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزّت اور شہرت پر حملہ ہونے دیا جائے گا۔ ہر بچے کو اس بارے میں قانونی تحفظ حاصل کرنے کا حق ہوگا۔

۱۷۔ حکومت اس بات کا انتظام کرے گی کہ بچوں کو ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبار اور رسالوں کے ذریعے دنیا بھر سے ایسی مفید معلومات حاصل ہوتی رہیں جن سے ان کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی تربیت ہو۔ انہیں اپنے ملک کے رسم و رواج اور رہنے سہنے کے طریقوں کا علم ہو اور وہ دوسرے ملکوں کے بچوں کو بہتر طور پر جاننے لگیں۔ بچوں کو نقصان دہ معلومات، کتابوں فلموں اور پروگراموں سے بچانے کے لئے حکومت ضروری کارروائی کرے گی۔

۱۸۔ بچوں کی اچھی تربیت اور بہتر دیکھ بھال، ماں اور باپ دونوں کی یا سرپرست کی بنیادی ذمہ

داری ہے۔ حکومت ہر طرح سے مدد کرے گی کہ ماں باپ ذمہ داری پوری کر سکیں۔

۱۹۔ حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ بچوں کو ہر قسم کی لاپرواہی اور برے سلوک سے بچائے چاہے یہ غلط سلوک بچے کے ماں باپ، سرپرست یا ان کی دیکھ بھال کرنے والے کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت نہ صرف ایسے برے سلوک کے خاتمے کے لئے کارروائی کرے گی بلکہ برے سلوک کا شکار ہونے والے بچوں کی بحالی کے لئے بھی کام کرے گی۔

۲۰۔ ہر حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ایسے بچوں کی خاص طور پر حفاظت کرے جن کا کوئی گھر بار نہیں رہا۔ حکومت ان کے لئے گھر جیسا ماحول مہیا کرے گی یا ایسے ادارے قائم کرے گی جو ان بچوں کی مناسب دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ ادارے ان بچوں کے رہنے سہنے کے طریقے اور رسم و رواج کے مطابق بنائے جائیں۔

۲۱۔ ان ملکوں میں جہاں بچوں کو گود لینے کا رواج یا اجازت ہے ایسا اسی وقت کیا جا سکے گا جب یہ بات بچے کے بہترین فائدے میں ہو۔ اس بارے عدالت سے منظوری لینا ہوگی اور جس بچے کو گود لیا جا رہا ہے اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے ضروری حکم جاری کئے جائیں گے۔

۲۲۔ ہجرت کرنے والے مہاجر بچوں یا پناہ کی درخواست کرنے والے بچوں کی حفاظت کا خاص طور پر انتظام کیا جائے گا۔ حکومت کا فرض ہوگا کہ ایسے بچوں کی حفاظت اور مدد کرنے والے اداروں سے پورا تعاون کرے۔

۲۳۔ معذور بچوں کا یہ حق ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور خاص طریقوں سے دیکھ بھال کی جائے تاکہ وہ ہر طرح سے اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کے قابل ہو جائیں اور کسی پر بوجھ بننے کی بجائے معاشرے میں ایک بھرپور زندگی گزار سکیں۔

۲۴۔ ہر بچے کے اس حق کو تسلیم کیا جائے گا کہ پوری طرح تندرست اور توانا ہو اور اسے صحت اور طب کی ضروری سہولت حاصل ہو۔ اس بارے میں پرہیز اور ابتدائی طبی دیکھ بھال پر خاص طور پر زور دیا جائے گا انہیں صحت کی تعلیم دی جائے گی اور ننھے منے بچوں کی مرنے کی شرح کو کم کیا جائے گا۔ حکومت اس بات کا خیال رکھے گی کہ صحت کے بارے میں دنیا کے دوسرے ملکوں سے بھی تعاون حاصل کیا جائے گا۔

۲۵۔ بچوں کی حفاظت، دیکھ بھال اور علاج کے اداروں کی کارکردگی کا وقفے وقفے سے حکومت جائزہ لے گی تاکہ بچوں کو ملنے والی سہولتوں کا کم از کم معیار قائم رکھا جا سکے۔

۲۶۔ تمام ملک بچوں کے اس حق کو مانتے ہیں کہ ان کو ضروری سماجی حفاظت ملنی چاہئے جس میں بیمہ کی سہولت بھی شامل ہے۔ حکومت قومی قانون کے مطابق یہ سہولتیں مہیا کرنے کی پابند ہوگی۔

۲۷۔ ہر بچے کا یہ حق ہے اور اسے زندگی کے کم از کم معیار کے مطابق سہولتیں دینا بچے کے ماں باپ کی پہلی ذمہ داری ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ اس ذمہ داری کو پورا کروایا جائے اور اسے پورا کرنے میں ماں باپ کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔ ان سہولتوں میں روٹی کپڑے اور مکان کی سہولتیں بھی شامل ہیں۔

۲۸۔ تعلیم حاصل کرنا ہر بچے کا بنیادی حق ہے اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ پرائمری تک تعلیم کو لازمی اور مفت فراہم کیا جائے۔ اسکول کے نظم و ضبط کو قائم کرتے وقت بچے کی عزت نفس کا خیال رکھا جائے۔ بچے کے اس حق کو یقینی بنانے کے لئے دوسرے ملکوں کا تعاون اور مدد بھی حاصل کی جائے۔

۲۹۔ حکومت تعلیم کے نظام کو اس طرح بہتر بنائے گی کہ اس سے بچے کی صلاحیت اور شخصیت کو نکھارا اور اسے ایک اچھا شہری بننے کے قابل بنایا جاسکے اور اس میں انسانی حقوق، اپنی روایات اور رسم و رواج کا احترام کرنا سکھایا جائے۔

۳۰۔ ملک کی اقلیتی آبادی کے بچوں اور بعض علاقوں میں وہاں پرانے زمانے سے رہنے والے لوگوں کے بچوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی زبان، مذہب اور رہن سہن کے طریقوں کے مطابق پوری آزادی سے اپنی زندگی گزار سکیں حکومت ان کے اس حق کی حفاظت کرے گی۔

۳۱۔ بچوں کا یہ حق ہے کہ انہیں تفریح اور کھیل کا موقع ملنا چاہئے اسی طرح انہیں اپنے ملک کے رسم و رواج کے مطابق تصویریں بنانے، موسیقی، گیت، ڈرامے، شاعری اور علم و ادب کے دوسرے کاموں میں بھی حصہ لینے کا موقع ملنا چاہئے۔

۳۲۔ حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ بچوں کو ایسے کاموں سے بچائے جن سے ان کی صحت، تعلیم یا ذہنی و جسمانی ترقی میں رکاوٹ پڑ سکتی ہو۔ حکومت روزگار کے لئے کام کرنے کی کم از کم عمر مقرر کرے گی اور ملازمت کی شرائط طے کرے گی۔

۳۳۔ بچوں کا یہ حق ہے کہ انہیں نشے والی دواؤں سے محفوظ رکھا جائے اور ایسی خطرناک دواؤں کی تیاری یا تقسیم میں بچوں کو کسی طرح بھی استعمال نہ کیا جائے۔ حکومت اس بارے میں ضروری قانون بنائے گی اور ان پر عمل بھی

کرائے گی اس کے علاوہ لوگوں کو اس بات کی تعلیم بھی دی جائے گی کہ بچوں کو ان خطرناک دواؤں سے دور رکھا جائے۔

۳۴۔ بچوں کو ہر قسم کی بدسلوکی، زیادتی اور بے حرمتی سے بچایا جائے گا اور ہر قسم کے مکروہ کاروبار سے بھی دور رکھا جائے گا۔

۳۵۔ حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنے ملک کے علاوہ دنیا بھر میں دوسروں سے مل کر ایسا انتظام کرے کہ بچوں کو زبردستی اغوا کرنے، انہیں دوسرے ملکوں میں پہنچا دینے اور ان کی خرید و فروخت جیسے مکروہ کاروبار کو ختم کیا جاسکے اور آئندہ بچوں کے اغوا کو روکا جاسکے۔

۳۶۔ بچوں کا یہ بھی حق ہے کہ انہیں ہر قسم کی ایسی لوٹ کھسوٹ سے بچایا جائے جو ان کی ترقی میں رکاوٹ بنے۔

۳۷۔ بچوں کو ہر قسم کے تشدد، ظالمانہ سلوک اور سخت سزاؤں سے جن میں موت اور عمر قید کی سزا شامل ہے۔ محفوظ رکھا جائے گا۔

۳۸۔ ہر حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ جنگ میں بچوں کے بارے میں انسانی رواداری کے اصول کا احترام کرے گی۔ پندرہ سال سے کم عمر کے کسی بچے کو براہ راست جنگ یا لڑائی میں شامل نہیں کیا جائے گا اور نہ فوج میں بھرتی کیا جائے گا۔ جنگ سے بے گھر ہونے والے تمام

> دانائی کا ایک اصول ہے جس کی وجہ سے چیزیں سمندر میں ڈوبنے کے بعد ایک خاص گہرائی کے نیچے نہیں جاسکتیں لیکن کینگی کے سمندر میں ہم جتنا گہرا ڈوبنا چاہیں اتنا ہی آسان ہے۔ (کارلائل)
>
> ان لوگوں کو رائے دیجئے جو برے نہیں ورنہ آپ کی رائے ضائع ہوجائے گی۔ (شیکسپیئر)
>
> جو شخص کسی دوسرے سے فائدہ اٹھاتے وقت اس کا شکریہ ادا کرتا ہے وہ قرضے کی پہلی قسط ادا کرتا ہے۔

بچوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کی جائے گی۔

۳۹۔ حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ جنگ، تشدد، ظالمانہ سلوک، لاپرواہی یا لوٹ کھسوٹ کا شکار ہونے والے بچوں کا مناسب علاج اور دیکھ بھال کرے اور ان کی اپنے ماحول میں دوبارہ بحالی کے لئے ضروری کاروائی کرے۔

۴۰۔ جن بچوں پر کوئی الزام ہو یا انہوں نے کوئی جرم کیا ہو انہیں یہ حق حاصل ہوگا کہ ان کے انسانی حقوق کا احترام کیا جائے اور ان سے قانون کے مطابق سلوک کیا جائے انہیں قانونی امداد دی جائے تاکہ وہ اپنی صفائی پیش کرسکیں۔

۴۱۔ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اگر کسی ملک کے قانون یا عالمی قانون میں بچوں کے حقوق کا معیار موجودہ معاہدے سے بہتر ہے تو اس بہتر معیار کو قائم رکھا جائے گا۔

اپنے جوابات ۱۵ جولائی تک روانہ کر دیجئے

۱۔ غزوۂ خندق کے پہلے زخمی صحابیؓ کا نام بتائیے؟

۲۔ غزوۂ خندق میں خالد بن ولید نے کس صحابیٔ رسول کو شہید کیا تھا۔

۳۔ غزوۂ بدر میں آنحضورؐ کی حفاظت کرتے ہوئے کس صحابیٔ رسول کی اُنگلیاں شہید ہو گئی تھیں؟

۴۔ حضرت بلالؓ مسلمان ہوئے تو کون انہیں گلے میں رسی ڈال کر گھسیٹا کرتا تھا؟

۵۔ اس جھوٹے نبی کا نام بتائیے جس نے اپنی بیعت نہ کرنے پر صحابیٔ رسول حضرت حبیبؓ بن زید کو قتل کر کے ان کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے؟

۶۔ اس صحابیٔ رسول کا نام بتائیے جو طائف میں آنحضورؐ کی جانب آنے والے پتھروں کو اپنے جسم پر روکتے تھے؟

۷۔ غزوۂ احد میں کونسی صحابیہؓ آنحضرتؐ کی حفاظت کرتے ہوئے زخمی ہو گئی تھیں؟

۸۔ اہلِ اسلام میں کس صحابیؓ کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا؟

۹۔ اس صحابیہؓ کا نام بتائیے جن کے چار بیٹے جنگ میں شہید ہو گئے تھے؟

۱۰۔ کس خلیفۂ رسول نے اپنے قاتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ شخص مجھے قتل کرے گا؟

معلومات عامہ صحابہ کرام سلسلہ نمبر ۳ کے درست جوابات

۱۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس ۲۔ سورہ طٰہٰ ۳۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو ۴۔ حضرت علیؓ

۵ ۔ حضرت ابو ہریرہؓ ۶ ۔ حضرت یعلیٰؓ بن امیہ ۷ ۔ حضرت بلال حبشیؓ

۸ ۔ حضرت عقبہؓ بن عامر جہنی

بالکل دُرست جوابات ارسال کرنے والوں کے نام :

اسما محمود، محمد ظفر اللہ ضیا، محمد ظفر ڈوگر، علی رضا خاں، کمالیہ۔ فیض الرحمٰن، سلمان وحید، اقصیٰ وحید، مس اقراء عبدالرؤف ثاقب، مس فخر فاطمہ، چوہدری محمد یوسف، مس سدرہ عروج، سکینہ بی بیب، مس النعیم وحید، ساہیوال۔ عبدالسلام عادل، حیدر آباد۔ مس رفعت بانو، چیچہ وطنی۔ نیلوفر قندیل، محمد سلیم، طاہرہ، محمد رمضان شاہد، محمد عمر شہزاد، مختار احمد عابد، محمد شبیر صدیقی، فیصل عمران، عمر فاروق قیصر، کمالیہ۔

بذریعہ قرعہ اندازی انعام حاصل کرنے والے تین خوش نصیب :

۱۔ فیض الرحمٰن، پاکپتن ۔ ۲۔ عبدالسلام عادل، حیدر آباد۔ ۳۔ عمر فاروق قیصر، کمالیہ۔

ادیب بتایئے انعام پایئے

فروغ تعلیم نمبر میں بچوں کے ایک مقبول ادیب کی کہانی "شمعیں جلائے رکھنا" شائع ہوئی جو ان کے ایک کتابی مجموعے سے انتخاب کی گئی۔ اس تحریر کے مصنف اور ان کے کتابی مجموعے کو بُوجھنے کی دعوت قارئین آنکھ مچولی کو دی گئی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ قارئین کی کثیر تعداد نے انہیں بوجھ لیا۔

کہانی کا نام : "شمعیں جلائے رکھنا" مصنف : محمد عمر احمد خان

جس کتاب سے انتخاب کی گئی : "ٹوٹے کھلونے"

بذریعہ قرعہ اندازی ایک دلچسپ اور مزے دار ناول "حق اسکواڈ" حاصل کرنے والے پانچ خوش نصیب :

۱۔ مونا اقبال، کراچی۔ ۲۔ ثروت ضیا، اسلام آباد ۳۔ بلال شاہد ۴۔ عفیفہ اطہر، گڈو (سندھ)۔ ۵۔ محمد اسد اللہ، کراچی۔

زلاٹا کی ڈائری سے

شیخ محمد عاکف حمید

جس دکھ اور کرب سے آج بوسنیا دوچار ہے اس کا احساس تو اس ۱۴ سالہ زلاٹا کو بڑی شدت کے ساتھ ہے جس نے دو سال تک جنگ کی رُوداد اپنی ڈائری میں قلم بند کی ہے۔ ۱۹۹۱ء کے آخری دور میں زلاٹا فلیبو جو اس وقت دس سال کی تھی۔ بوسنیا کی رہنے والی اس بچی کے والدین مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ سراجیو میں اس نے ڈائری لکھنے کی ابتدا کی۔ دو سال کے عرصے میں جیسے جیسے جنگ کے شعلے بُلند ہوتے رہے یہ ایک معصوم کلی سے ایک خوبصورت پھُول بن گئی۔ اس نے اپنا موازنہ ڈنمارک کی یہودی لڑکی "این فرینک" سے کرنا شروع کردیا جسے نازیوں نے ہلاک کردیا تھا اور جس کی موت کے بعد اس کی تحریر کردہ ڈائری برآمد ہوئی تھی۔

زلاٹا خوش نصیب تھی کہ ایک امن گروپ

نے اس کی ڈائری کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ ایک فرانسیسی پبلشر نے اس ڈائری کے حقوق پورے یورپ کے لئے حاصل کئے اور زلاٹا کو اس کے خاندان سمیت سراجیو سے نکالا۔ زلاٹا جو کہ اب ۱۴ برس کی ہے' اپنے والدین کے ساتھ پیرس میں رہتی ہے۔ اس کی ڈائری سے چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

پیر' ۳۰ مارچ ۱۹۹۲ء

"سُنو! میری ڈائری تمہیں پتہ ہے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ این فرینک نے اپنی ڈائری کا نام کیٹی رکھا تھا کیوں نہ میں بھی تمہیں کوئی نام دے دوں! تمہیں میں سفیکا کہوں سوہلا کہوں یا ممی کے نام سے پکاروں؟ چلو تمہیں ممی کا نام دے دیتی ہوں۔ ہاں تو پیاری ممی اب ہمارے تعلیمی سال کا نصف گزر چکا ہے ہم سب ششماہی امتحانات کی تیاری کر رہے ہیں۔ کل شہر کے ڈائننگ ہال میں سالانہ کلاسیکل موسیقی کا جشن ہے ہماری استانی نے ہمیں منع کیا ہے کہ ہم جشن میں نہ جائیں کیونکہ وہاں ۱۰۰۰۰ سے زیادہ بچے ہوں گے کوئی ہمیں یرغمال بنا سکتا ہے یا ڈانس ہال میں بم رکھ سکتا ہے۔ اُستاد کا حکم ماننا اچھی بات ہے۔ اس وجہ سے میں وہاں نہیں گئی۔"

اتوار' ۵ اپریل ۱۹۹۲ء

"پیاری ممی! میں پڑھائی کی طرف راغب ہونے کی پوری کوشش کر رہی ہوں لیکن میرا ذہن بھٹکا ہوا ہے اس شہر میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ گولیوں کی آواز پہاڑیوں کی طرف سے آ رہی ہے۔ لوگوں کے جتھے چاروں طرف پھیل رہے ہیں۔ وہ کسی چیز کو روکنا چاہتے ہیں لیکن انہیں خود نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز ہے جسے انہیں روکنا ہے ہم سب محسوس کر سکتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے جو کہ بہت ہی خوفناک ہے۔ ٹی وی پر میں نے لوگوں کے ہجوم کو پارلیمنٹ کی طرف نعرے لگاتے جاتے دیکھا ہے جو سراجیو کی محبت کے گیت گا رہے ہیں یہ سب بظاہر اُمید افزا لگتا ہے لیکن میرے پیٹ میں دہشت اور خوف سے مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔"

پیر' ۲۸ اپریل ۱۹۹۲ء

"پیاری ممی ہائے! مارٹینا آہ! مائیا آہ! آہ یہ دونوں کل سراجیو چھوڑ گئیں وہ بس کے ذریعے سلوینیا چلی گئیں۔ اوگا بھی جا چکی ہے اور ڈی جان بھی' مرینا کل یا پرسوں چلی جائے گی اور جلد ہی ماریجینا بھی چلی جائے گا آہ! آہ! سب لوگ چلے گئے ہیں میری اب کوئی سہیلی نہیں رہی۔"

جمعرات' ۷ مئی ۱۹۹۲ء

"پیاری ممی! اب سے پہلے مجھے یقین تھا کہ یہ لڑائی ختم ہو جائے گی لیکن آج ..... ایک بم ہمارے گھر کے سامنے والے باغ میں گرا جہاں

میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ نینا میری سہیلی کے دماغ میں بم کا ٹکڑا لگا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئی اب میں نینا کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ وہ ۱۱ سال کی معصوم اور پیاری لڑکی تھی میں بُری طرح رو رہی ہوں اور بہت اُداس ہوں۔ جنگ کرنے والوں نے بے گناہ بچے کی جان لے لی۔ آہ! نینا میں تمہیں ہمیشہ ایک پیاری دوست کی حیثیت سے یاد رکھوں گی۔"

جمعہ، ۵ جون ۱۹۹۲ء

"پیاری ممی! اب کافی عرصے سے بجلی غائب ہے ہمیں فریزر میں پڑے کھانے کی فکر ہے جو بغیر بجلی کے خراب ہوجائے گا۔ اس میں گوشت، پھل، سبزیاں ہیں۔ ابو نے ایک پرانے اسٹو کو ڈھونڈ نکالا ہے اور فریزر میں پڑا کھانا پکانے کا بندوبست کیا ہے ہم نے پڑوسیوں کے ساتھ مل کر خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور ڈر بھی لگ رہا ہے کہ کہیں بدہضمی کا شکار نہ ہوجائیں۔"

بدھ، ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۲ء

"پیاری ممی! میری سہیلی ماجا اب ہماری ٹیچر اسٹرینا کے ساتھ کام کررہی ہیں۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ڈائری لکھتی ہوں جب میں نے ہاں میں جواب دیا تو اس نے پوچھا کہ یہ ڈائری میری ذاتی زندگی کے بارے میں ہے یا جنگ کے بارے میں، تو میں نے اسے بتایا کہ اب تو یہ جنگ کے بارے میں ہی ہے۔ اس پر ماجا بہت خوشی ہوئی اس نے مجھے بتایا کہ یونیسف والے کسی بچے کی ڈائری شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں نے تمہاری کاپیاں کرکے ان کو دے دی ہیں اور ممی! اب تم بہت جلد یونیسف ویک میں شائع ہوجاؤ گی۔"

جمعرات، ۳ دسمبر ۱۹۹۲ء

"پیاری ممی! آج میری سالگرہ ہے۔ جنگ کے دوران یہ میری پہلی سالگرہ ہے۔ آج میں بارہ سال کی ہوگئی ہوں۔ امی ابو اور باقی لوگوں نے مجھے پیار کیا۔ امی ابو نے مجھے تحفے بھی دیئے۔ معمول کے مطابق بجلی آج بھی غائب تھی۔ آنٹی ملیکا اپنے بچوں "کستان" "نائیدہ" اور "نہار" کے ساتھ آئیں۔ مجھے چاکلیٹ، وٹامن، چابیوں کا چھلا اور بہت سے تحفے ملے ہیں۔ یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے لیکن ایک چیز کی شدت سے کمی محسوس ہوئی اور وہ ہے "امن"

منگل، یکم جون ۱۹۹۳ء

"پیاری ممی! کل اپنی پیاری چڑیا کے مرجانے پر میں بہت غمزدہ تھی۔ آج کچھ بہتر ہوں۔ آج ناشتہ دوپہر اور رات کا کھانا نہ پک سکا کیونکہ کل گیس آنی بند ہوگئی۔ بجلی پہلے ہی نہیں ہے ہم سب بڑی مشکل میں ہیں۔ مجھ سے اب

یہ سب برداشت نہیں ہوتا اس بات کا بہت امکان ہے کہ میں اپنے آپ کو ختم کرلوں یعنی اگر وہ تمام جنگی جنونی اس سے پہلے اگر مجھے نہ بھی مار سکے تو لگتا ہے میں بازی ہار چکی ہوں گی۔"

ہفتہ ۱۷ جولائی ۱۹۹۳ء

"پیاری ممی! آج میری ڈائری کی تعارفی تقریب تھی میں تمہیں تو ساتھ نہ لے جاسکی لیکن تمہارا کچھ حصّہ وہاں موجود تھا۔ تقریب بہت اچھی تھی ایک خوبصورت لڑکی نے تمہارا کچھ حصّہ پڑھ کر سُنایا۔ پھر پیغام پڑھ کر سُنایا جس میں لڑائی میں شریک فریقین میں سے مطالبہ کیا کہ میرا بچپن مجھے لوٹا دیں۔ جہاں میں مطمئن اور خوش تھی جیسے کہ سب بچے اپنے بچپن میں خوش ہوتے ہیں بچّوں کا بچپنا تباہ نہ کرو۔ مجھے صرف اور صرف ایک چیز کی خواہش ہے اور وہ ہے امن، امن، امن۔"

جمعہ ۲۳ جولائی ۱۹۹۳ء

"پیاری ممی! ۱۷ جولائی کے بعد سے میرے پاس دنیا بھر سے اخباری نمائندے آرہے ہیں اسپین سے، فرانس سے، امریکہ اور برطانیہ سے حتیٰ کہ "اے بی سی ٹی وی" امریکہ کا عملہ بھی میرے انٹرویو کے لئے آیا۔ انہوں نے میری فلم بطور ہفتے کی شخصیت کی حیثیت سے بنائی لیکن اس تمام شہرت کے باوجود میں سوچتی ہوں کہ کیا دنیا کو وہ اندھیرا نظر آجائے گا جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، ہماری زندگی باہر کی خوبصورت اور روشن زندگی سے کس قدر مختلف ہے۔ کاش! اس کا احساس سب کو ہوجائے۔"

پیر، ۲ اگست ۱۹۹۳ء

"پیاری ممی! بعض لوگ میرا موازنہ این فرینک سے کرتے ہیں اس بات سے میں خوف زدہ ہوجاتی ہوں کیا میرا انجام بھی این فرینک جیسا ہوگا؟"

بدھ، ۱۸ اگست ۱۹۹۳ء

"پیاری ممی! کل ہم نے ایک اُمید افزا خبر سُنی سیاستدانوں نے جنیوا میں سراجیو کو اسلحہ سے پاک کرنے کے معاہدے پر دستخط کردیئے ہیں میں کیا کروں؟ میں اس معاہدے پر یقین کرلوں؟" میں ایسا نہیں کرسکتی جب بھی میں نے کسی بات کی امید کی ہے یا اعتبار کیا ہے وہ بات ہوئی نہیں اور جب میں نے سوچا ہے کہ کوئی بات نہیں ہوگی تو وہ ہوگئی ہے۔"

اتوار، ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء

"پیاری ممی! کل پہاڑیوں پر موجود ہمارے دوستوں نے موجودگی کا صحیح احساس دلایا اور باور کرایا کہ اب اختیارات ان کے پاس ہیں اور وہ اپنی مرضی سے کسی کو قتل زخمی یا تباہ کرسکتے ہیں کل کا دن واقعی بڑا بھیانک تھا۔ صبح ساڑھے چار

سے لے کر تمام دن میں چار سو نوے گولے پھینکے گئے۔ چھ افراد اور ۵۶ زخمی ہوئے۔ مجھے نہیں معلوم ملیکا کہاں ہے کہتے کہ قرب و جوار کے آدھے مکین گھر بار چھوڑ کر جا چکے ہیں۔"

"ہم اپنے اندھیرے گودام میں چھپ گئے آدھا محلّہ ہمارے ساتھ تھا جبکہ گولہ باری متواتر جاری تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اس طرح سے گولہ باری مسلسل جاری رہے تو یہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ جب یہ کچھ دیر کے لئے رُکتی ہے تو وقتی سکون اس وقت بالکل برباد ہو جاتا ہے۔ جب یہ دوبارہ شروع ہوتی ہے مجھے یقین ہے یہ اب کبھی بند نہ ہوگی کیونکہ کچھ لوگ اس جنگ کو ختم کرنا نہیں چاہتے ایسے بڑے لوگ جو بچوں اور عام لوگوں سے نفرت کرتے ہیں ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہم بے گناہ ہیں لیکن بے یار و مددگار ہیں!!"

زلاٹا کی ڈائری کا مقصد

اس بچّی کی ڈائری کو ذرائع ابلاغ خاص طور پر امریکہ، یورپ میں خوب اُچھالا گیا ہے لیکن بوسنیا میں جنگ اب بھی جاری ہے۔ زلاٹا اور اس کے والدین کو تو پریس میں پناہ مل گئی لاکھوں زلاٹائیں اور ان کے والدین ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں اس بچی کی ڈائری سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ صرف اپنے لئے نجات حاصل کرنا نہیں چاہتی بلکہ وہ ظلم تشدّد کی اس لہر کو جو بوسنیا میں جاری ہے ختم کروانا چاہتی تھی اور تمام بچّوں اور تمام لوگوں کے لئے امن کی بھیک چاہتی ہے۔ امن ...... امن جس میں سب کے لئے سکون ہے!!

آنکھ مچولی کے پرانے شمارے کیسے منگوائیں؟

ہمیں قارئین کے ایسے بہت سے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں وہ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانے کا طریقہ کار دریافت کرتے ہیں۔ اگر آپ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانا چاہتے ہیں تو ان شماروں کی تفصیل، نصف قیمت کا منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتا ہمیں روانہ کر دیجئے۔ ہم پرچے آپ کو بھجوا دیں گے۔

خط و کتابت کے لئے پتا:

مینیجر سرکولیشن، ماہنامہ آنکھ مچولی I۔ پی آئی بی کالونی کراچی ۵ فون: ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا.... بتادو نا
NAZ
DELICIOUS
PAN MASALA
NAZ
ناز پان
مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS
P.O. BOX 3546, KARACHI-74800 PAKISTAN
CABLE: "TWO-IN-ONE" FAX: 021-7219548

اللہ میاں کے پاس

مس فرحین

سردیوں کی اس رات ٹھنڈی ہوائیں سری نگر کی گلیوں میں یوں آزادانہ گھوم رہی تھی جیسے کوئی بد روح رات کے سناٹے میں چہل قدمی کر رہی ہو۔ سنسان گلیاں سانپ کی مانند بل کھاتی دھند و کہر میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ان گلیوں میں ظلم کا اندھیرا اپنا راج جمائے ہوئے تھا کہیں کہیں کمزور سے بلب بجلی کے کھمبے پر ٹکے ہوئے تھے وہ ان کے میلی سی روشنی اس بات کا احساس دلا رہی تھی جیسے کوئی بیمار، غم زدہ چہرہ جھکا ہوا ہو۔

اس خوفناک ماحول میں ہوا کی سائیں سائیں کے ساتھ جب بھارتی فوجیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز گونجتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی ویران حویلی کے بھاری دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ کھٹ کھٹ کھٹ یا بندوقیں لوڈ کرنے کی بھیانک آوازیں..... بس اس کے آگے کوئی شور نہ تھا۔ گلی کے دونوں سروں پر مکانات سر نکالے جھانک

رہے تھے۔ اور ان کے ٹوٹے پھوٹے مکانات کے اندر تھے ٹوٹے پھوٹے مکین لیکن عزم، ہمت اور صبر اور ارادے میں اٹل۔ گلی کے آخری سرے پر کچھ مکانات چھوڑ کر ایک بوسیدہ سا مکان کھڑا تھا جس کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ مکان کے اندر ایک کمرے میں چھوٹا سا دیا جل رہا تھا۔ جس کی ناکافی روشنی اندھیرے میں مدغم ہو رہی تھی۔ اس مدہم روشنی میں ایک چھ سالہ کشمیری بچہ اور اس کی ماں کا چہرہ نمایاں تھا جو رات کا کھانا چولہے پر رکھ رہی تھی۔ سرخ و سفید گالوں اور گلابی ہونٹوں کی پپڑیوں پر بار بار زبان پھیرتا وہ کشمیری بچہ پھٹا پرانا کمبل اوڑھے ایک کونے میں اپنی ماں کے قریب ٹھنڈے فرش پر بیٹھا ایک ٹک اس دیگچی کی طرف دیکھ رہا تھا جو ماں نے چولہے پر چڑھا دی تھی اور کھانا گرم کرنے کے لئے اب ماچس تلاش کر رہی تھی۔ یہ بچہ حسین تھا جس کا باپ کشمیر کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے ڈوگرا سپاہیوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا تھا۔ بچہ ابھی ماں کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ ہلکی سی آہٹ ہوئی اور بھورے رنگ کا ایک موٹا سا چوہا بھاگ کر بکس کے پیچھے چھپ گیا۔ بکس کے پیچھے حسین کی کتابیں رکھی تھیں۔ حسین نے فوراً ہی سامنے پڑا ہوا ڈنڈا اٹھایا اور اسے مارنے کے لئے دوڑ پڑا۔

"مت مارو بیٹا" حسین کی امی نے حسین کے ہاتھ سے ڈنڈا لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں امّی میں اسے ضرور ماروں گا۔ یہ میری کتابیں کھا گیا ہے اب جب میں اسکول جاؤں گا تو گندے بچوں کی طرح میری کتابیں پھٹی ہوئی ہوں گی۔" حسین نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جانے دو بیٹے یہ بھی تو ہماری طرح بھوکا ہے اگر تمہاری کتابوں کے ذریعے اسے رزق مل جاتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے میں تمہیں نئی کتابیں لادوں گی۔" ماں نے حسین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا امّی! آپ کہتی تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں مگر آخری مرتبہ اب اگر اس نے پھر میری کتابیں کھائیں تو میں اسے ضرور ماروں گا۔" حسین نے ڈنڈا واپس رکھ دیا اور دوبارہ فرش پر بیٹھ کر اپنی ماں کو دیکھنے لگا شاید اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔

"امی آپ مجھے نئی کتابیں کب لادیں گی میرا بہت دِل کرتا ہے پڑھنے کو۔" حسین نے بھوک کی بڑھتی ہوئی خواہش کو کم کرنے کے لئے ماں سے باتیں شروع کر دیں۔

"بیٹا! ابھی تو تمہارے اسکول بند ہیں نا جب کھلیں گے تب لادوں گی۔" ماں نے حسین کی

طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن امی میرے اسکول کب کھلیں گے آپ تو روز کہتی ہیں کہ کھل جائیں گے مگر کب امی؟" حسین نے اُداس ہوتے ہوئے ماں سے سوال کیا۔

"بیٹا! بس تم اللہ میاں سے دُعا کرتے رہو اللہ میاں بچوں کی دُعا ضرور سُنتے ہیں۔" ماں نے حسین سے کہا۔

"امی جی! میں تو روز بلکہ ہر وقت ہی دُعا کرتا ہوں مگر اللہ میاں تو نہیں سُنتے۔" حسین نے ماں سے کہا۔

"نہیں بیٹے ایسا نہیں کہتے اللہ میاں ہر دُعا ضرور سُنتے ہیں جس طرح ہر انسان کی پیدائش اور موت کا وقت مقرر ہے اسی طرح دُعا کی قبولیت کا بھی وقت مقرر ہوتا ہے اور وقت پورا ہو جانے پر دُعا ضرور قبول ہوتی ہے۔" ماں نے حسین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر امی میں تو اتنے دنوں سے دُعا مانگ رہا ہوں کہ یہ گندے لوگ ہمارے کشمیر سے چلے جائیں تاکہ میرا اسکول پھر سے کھل جائے لیکن میری دُعا ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔" حسین نے ماں کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے کہ اللہ میاں ہم سے بہت دُور رہتے ہیں نا اس لئے دُعا ان تک دیر میں پہنچتی ہے۔ جب پہنچ جائے گی تو وہ ضرور سُنیں گے۔" ماں نے حسین کو سمجھایا۔

"اچھا تو یہ بات ہے لیکن امی اگر میں اللہ میاں کے پاس خود جا کر کہوں تب تو وہ فوراً سُن لیں گے نا۔"

حسین نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے حسین کو چمٹائے ہوئے کہا۔ "بیٹا! جو لوگ اللہ میاں کے پاس چلے جاتے ہیں وہ پھر دوبارہ واپس نہیں آتے۔ مجھے اکیلے چھوڑ کر نہ جانا۔"

"نہیں امی میں آپ کو بھی وہاں بلا لوں گا یا پھر اللہ میاں سے کہوں گا کہ میری امی میرے بغیر اُداس رہتی ہیں آپ مجھے جانے دیں وہ مجھے ضرور جانے دیں گے اور امی میں ایسے ہی تھوڑی جاؤں گا اچھے اور صاف کپڑے پہن کر جاؤں گا۔ اللہ میاں کو اچھے بچے اچھے لگتے ہوں گے ناں امی؟"

ماں یہ سُن کر کانپ گئی۔ "ماچس مل گئی ہے میں تمہارے لئے کھانا گرم کر کے نکالتی ہوں چلو کھانا کھالو۔" یہ کہہ کر ماں اُٹھ گئی۔ حسین منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ ماں رات کا بچا کھچا کھانا اس کے لئے ہانڈی سے نکال لائی۔ وہ جلدی جلدی کھانا کھانے لگا۔ ماں بھی بھوکی تھی لیکن کھانا ایک آدمی کا تھا۔ دوپہر میں خاصی گرمی تھی۔ حسین نے سفید کُرتا پاجامہ پہنا اور یہ دیکھ

کر کہ ماں بے خبر سو رہی ہے، کنگھے سے بالوں کو سنوارنے لگا۔ بال سنور گئے تو وہ سوچنے لگا: "اللہ سے ملنے جانا چاہئے۔ کہاں ملے گا اللہ مجھے؟ ماں کو اُٹھا کر پوچھتا ہوں۔" وہ ماں کی طرف بڑھا لیکن پھر پیچھے ہٹ گیا۔ ماں اُٹھ جاتی تو اسے گھر سے باہر ہی نہ جانے دیتی۔ حسین خوشبو کے معصوم جھونکے کی طرح چپکے سے سری نگر کی گلیوں میں نکل آیا۔

چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی۔ حسین دبے قدموں سے چلتا ایک گلی کے کونے تک ہی پہنچا تھا کہ بندوق کی نال پیچھے سے اس کے کمزور شانے سے آ لگی۔

"اوئے کدھر جا رہا ہے؟" تجھے معلوم نہیں ہے کہ کرفیو لگا ہوا ہے۔" بھارتی فوج کے ایک سپاہی نے اپنی سُرخ سُرخ لہو برساتی خوفناک آنکھوں سے حسین کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں اللہ میاں کے پاس جا رہا ہوں۔" حسین نے بے خوفی سے جواب دیا۔

ہاہاہا..... سپاہی کا خوفناک قہقہہ گلی میں گونج اُٹھا تو مکانات کے بند دروازے اور کھڑکیاں کھُل گئیں۔

"اچھا تو تو اپنے اللہ کے پاس جا رہا ہے۔ اللہ تو بہت دُور ہے تیرا۔ کوئی تانگہ کوئی سائیکل کوئی رکشہ مطلب ہے کہ ایسے ہی پیدل چلے جاؤ گے۔" سپاہی نے اپنے پیلے پیلے نوکیلے دانت پھاڑ کر کہا۔

"اللہ میاں کے پاس رکشے تانگے نہیں جاتے۔" حسین نے فلسفیانہ انداز میں سپاہی کو گھورتے ہوتے کہا۔

"اوئے پھر کیسے جاتے ہیں؟" سپاہی نے حسین سے سوال کیا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن اگر مجھے معلوم بھی ہوا تو میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ ہاں اللہ میاں کے پاس جا کر تمہاری اور تمہارے ظالم ساتھیوں کی شکایت ضرور کروں گا۔ تم لوگ بہت گندے ہو تم نے ہمارا گھر چھین لیا ہے اور ہمارے کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے۔ اللہ میاں میری شکایت ضرور سُنیں گے۔"

"اوئے تو کیا تمہارے اللہ میاں تمہاری بات سُنتے ہیں۔" ایک دوسرا سپاہی وہاں آ گیا اور بڑے تمسخر سے حسین سے پوچھنے لگا۔

"کیوں نہیں سُنتے وہ بچوں کی دُعائیں اور باتیں سنتے ہیں میں صاف سُتھرے کپڑے پہن کر جا رہا ہوں۔ اللہ میاں کو صاف سُتھرے لوگ اچھے لگتے ہیں۔"

"اوئے تم اچھے ہو تمہارا اللہ اچھا ہے تو کیا ہم گندے ہیں۔" دوسرے سپاہی نے غصیلے لہجے میں حسین کا شانہ زور سے ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں تم گندے ہو میں اللہ میاں سے تمہاری شکایت کروں گا۔" دوسرے سپاہی نے اپنے کاندھے سے بندوق اُتار کر لوڈ کرلی۔ پہلے سپاہی نے کہا۔ "او چھوڑ یار جانے دو۔ بچّہ ہے ناسمجھ ہے۔" "نہیں ..... میں اس کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔" اتنا کہتے ہوئے اس نے بندوق کی نال حسین کے سر پر ٹکا کر فائر کردیا۔ معصوم بچّہ ایک جھٹکے سے اُچھلا اور دور جاگرا۔ اس کے سر کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ زمین کا سینہ اس کے پاکیزہ سُرخ لہو سے سیراب ہو رہا تھا۔ ظالم سپاہی بچّے کی لاش کے قریب آیا اور اپنے فوجی بوٹ سے ایک زور دار ٹھوکر مار کر چیخا۔ "اوئے جاؤ اپنے اللہ سے شکایت لگاؤ۔ میں نے تمہیں تمہارے اللہ کے پاس پہنچا دیا ہے۔!!!" سری نگر کی اس گلی میں فوجیوں کے بوٹوں کی چاپ گونج رہی تھی اور کُھلنے والے دروازے اور کھڑکیاں آہستہ آہستہ بند ہو رہے تھے!!

سرب فوجیوں کی تین گولیوں نے اس معصوم کی ریڑھ کی ہڈی بے کار کردی۔ ڈاکٹر آپریشن کے ذریعے اس بوسنیائی بچے کے جسم سے گولیاں نکال رہے ہیں!!

بھارتی فوجیوں کے مظالم کا شکار دو کشمیری بچے!!

بوسنیائی نوجوان اپنے بھائی کے شدید زخمی ہونے پر رو رہا ہے!!

کشمیری ماؤں کی آہ وزاری.... آخر کب تک؟

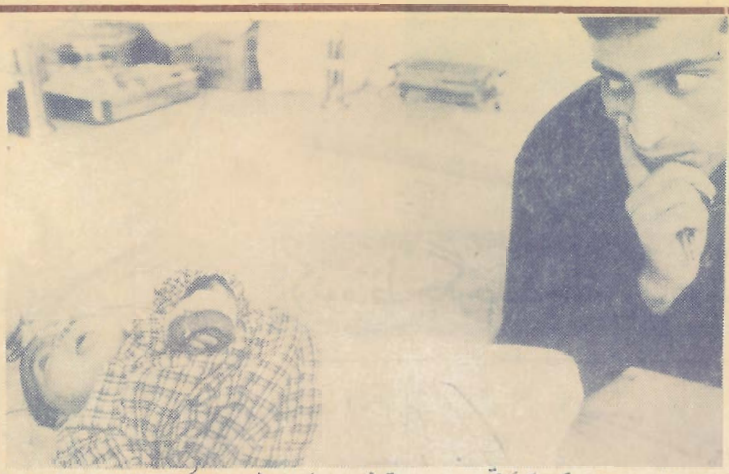

ع ابھی آئی تھی دنیا میں تو ظلم کے مناظر دیکھے
انتہائی نگہداشت کے شعبے میں ایک لبنانی باپ اپنی نوزائیدہ بچی کے ہمراہ!

فلسطینی ماں اپنی پانچ سالہ جلی ہوئی زخمی بچی کے بستر کے پاس غم سے نڈھال۔ اس بچی پر ایک اسرائیلی فوجی نے فرائی پین کا گرم گرم تیل پھینک دیا تھا۔

"اُف مرگیا ڈاکٹر! بہت تکلیف ہو رہی ہے!!" زخموں سے چُور یہ لبنانی نوجوان اسرائیلی طیاروں کی وحشیانہ بمباری کا شکار.....

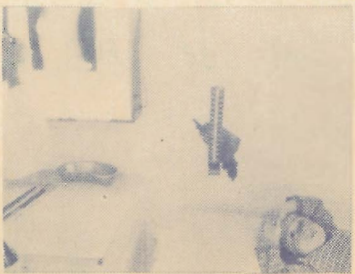

ایک ننھا فلسطینی بچہ اسپتال میں امداد کا منتظر۔ اس کی بائیں ٹانگ اسرائیلی فوجیوں نے توڑ دی ہے۔

اقوام متحدہ میں قرارداد پیش کرنے سے کیا اسرائیل کے مظالم سے نجات مل جائے گی؟

کریو منظرِ جگر جائے چھمن ماہِ مشانی

نغمہ خوان : عقیل مختار

کریو منظرِ جگر جائے چھمن ماہِ مشانی
بھلاؤں کیسے مناظر تیری بہاروں کے
کشمیر کشمیر بغیرِ بہارِ کشمیر، نہیں بھولے
میرے کشمیر میرے کشمیر اے کشمیر اے کشمیر
اے کشمیر تری جنت میں آئیں گے اک دن
ستم شعاروں سے تجھ کو چھڑائیں گے اک دن
کشمیر کشمیر
جہاد فرض ہے ہر شخص پر اگر یارب!
جھکا نہ پائے گا بھارت ہمارا سر یارب
ہم ایک جھٹکے سے خود اس کا سر جھکادیں گے
ترے بدن سے اے شہہ رگ تجھے ملادیں گے
بھلاؤں کیسے مناظر تیری بہاروں کے

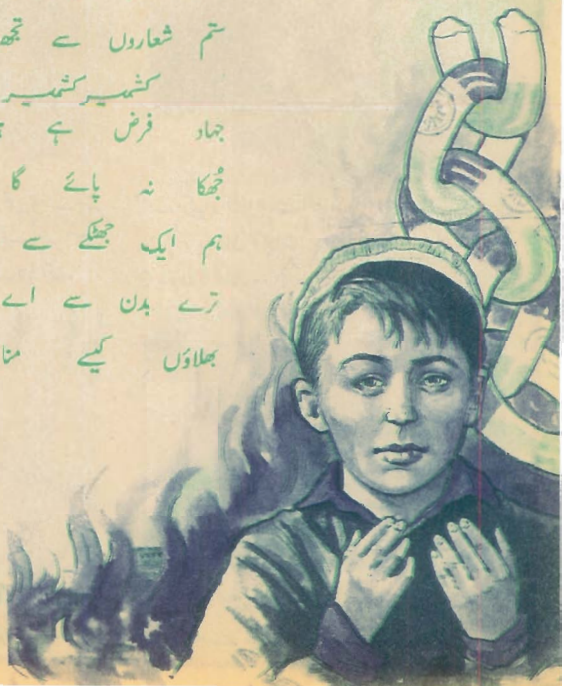

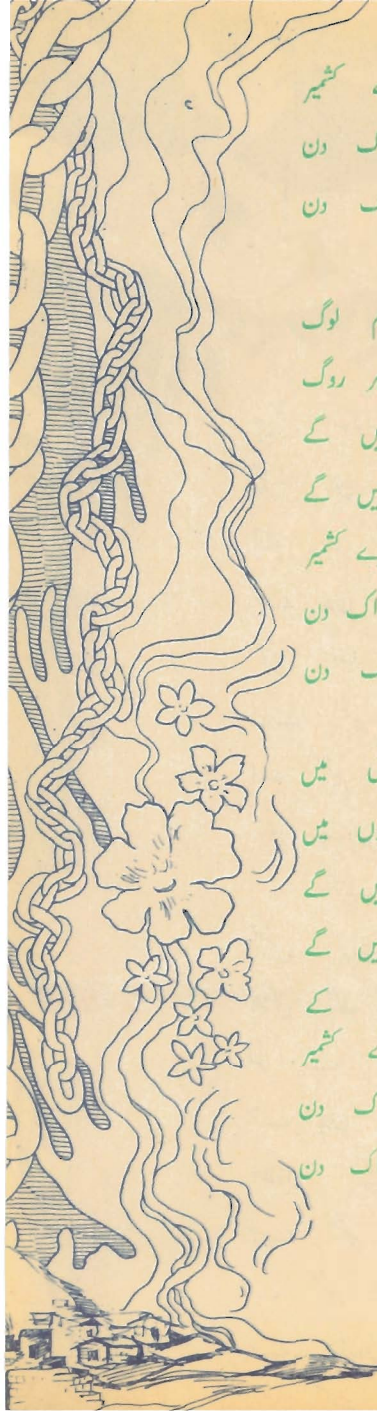

میرے کشمیر میرے کشمیر اے کشمیر اے کشمیر
اے کشمیر تری جنّت میں آئیں گے اک دن
تری فضاؤں میں کلیاں کِھلائیں گے اک دن
کشمیر کشمیر

جہادِ حق کے لئے بن کے غزنوی ہم لوگ
مِٹا کے چھوڑیں گے بھارت کے ظلم کا ہر روگ
کہ آج ہند کو بھی روس ہم بنا دیں گے
ترے بدن سے اے شہہ رگ تُجھے مِلا دیں گے
کشمیر بغیرِ بہارِ کشمیر، نہیں بھولے، میرے کشمیر میرے کشمیر
اے کشمیر اے کشمیر تری جنّت میں آئیں گے اک دن
چناب سے تری ڈل کو مِلائیں گے اک دن
کشمیر کشمیر

نہاں تھی تازہ سحر کی نوید آنکھوں میں
لہو کے خواب ہیں اب ان شہید آنکھوں میں
ہر اک زخم سے ہم اپنا تن سجا دیں گے
ترے بدن سے اے شہہ رگ تُجھے مِلا دیں گے
بھلاؤں کیسے مناظر تیری بہاروں کے
میرے کشمیر میرے کشمیر، اے کشمیر، اے کشمیر
اے کشمیر تری جنّت میں آئیں گے اک دن
ہم اپنے سینوں پہ ہر ظُلم کھائیں گے اک دن
کشمیر کشمیر

ہیں سوگوار مناظر تمام سڑکوں .....پر
مچل رہی ہیں یہ مائیں جوان موتوں پر
تمام ہند کو ہم خاک میں مِلا دیں گے
ترے بدن سے اے شہہ رگ تُجھے مِلادیں گے
کریو منظ جگر جائے چھمن ماہ مشانی
میرے کشمیر میرے کشمیر، اے کشمیر اے کشمیر
اے کشمیر تری جنّت میں آئیں گے اک دن
تری بہاروں میں ہم مُسکرائیں گے اک دن
کشمیر کشمیر

جُھلس رہے جہنم میں آج گھر سارے
بھڑکتی آگ کا ایندھن ہیں بام و در سارے
لہو سے آتشِ نمرود کو بجُھادیں گے
ترے بدن سے اے شہہ رگ تُجھے مِلادیں گے
بھلاؤں کیسے مناظر تیری بہاروں کے
میرے کشمیر میرے کشمیر، اے کشمیر اے کشمیر
اے کشمیر تری جنّت میں آئیں گے ایک دن
ترے چناروں کو دُلہا بنائیں گے اک دن
کشمیر کشمیر

یہ مائیں آگ میں ہر چیز چھوڑ آئی ہیں
مگر قُرآن بچا کر نکال، لائی ہیں
قسم قُرآن کی اک روز ہم دِکھائیں گے
ترے بدن سے اے شہہ رگ تُجھے مِلادیں گے
کشمیر بخیرِ بہارِ کشمیر نہیں بھولے
میرے کشمیر میرے کشمیر، اے کشمیر اے کشمیر
اے کشمیر تری جنّت میں آئیں گے اک دن
قُرآن لے کے زمانے پہ چھائیں گے اک دن
کشمیر کشمیر

یہ پاک باز جو اب گہری نیند سوتی ہیں
یہ اپنے خوں سے غُلامی کے داغ دھوتی ہیں
ہم اس ستم کا مزا ہِند کو چکھا دیں گے
ترے بدن سے اے شہہ رگ تُجھے مِلا دیں گے
بھلاؤں کیسے مناظر تیری بہاروں کے
میرے کشمیر میرے کشمیر، اے کشمیر اے کشمیر
اے کشمیر تری جنّت میں آئیں گے اک دن
ہر اک داغ غُلامی مِٹائیں گے اک دن
کشمیر کشمیر

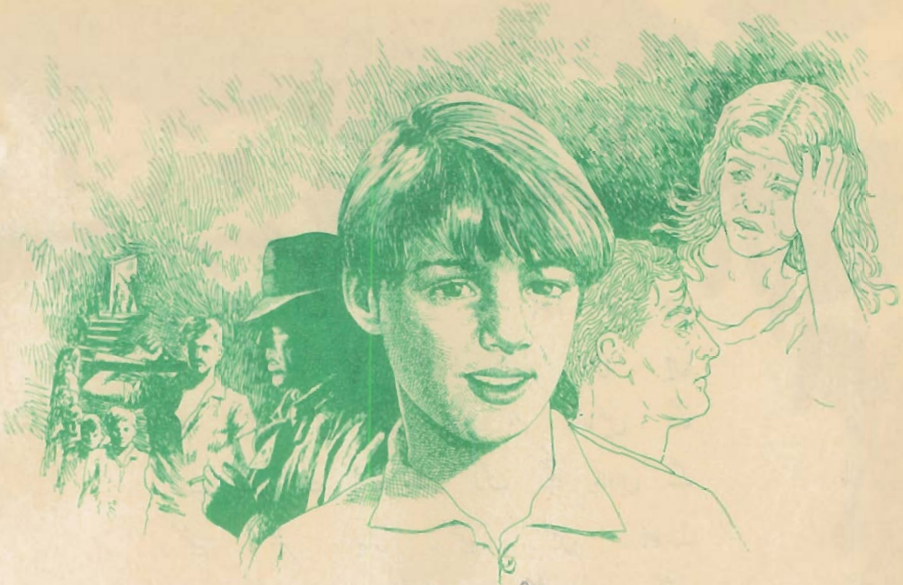

ماجد نہیں آئے گا

الطاف حسین

"یہ کیا ہے؟" بیگم کمال کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اور پھر وہ ملازم کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے رقعہ لے کر پڑھنے لگیں لکھا تھا :

بیگم کمال!

"آپ کا بیٹا آج آدھی چھٹی کے دوران اسکول سے غائب ہوگیا ہے۔ میں نے لڑکوں کے ذریعے اسے اسکول کے آس پاس تلاش کرایا لیکن وہ انہیں نہیں ملا..... براہ کرم آپ ماجد کو گھر آنے پر ضرور سمجھایئے گا کہ اس طرح اسکول سے بھاگنا کوئی اچھی بات نہیں..... اور کل آپ ماجد کے ساتھ اسکول آکر مجھ سے ملئے"

ہیڈ مسٹریس بلیو اسکائی پبلک اسکول

رقعہ پڑھنے کے بعد بیگم کمال سوچ میں پڑ گئیں۔ ان کا بیٹا ماجد پڑھنے لکھنے میں خاصا ذہین تھا اور وہ اس سے پہلے کبھی اسکول سے نہیں بھاگا

تھا۔ "لیکن؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے ڈرائیور کو بلوایا۔

"جی بیگم صاحبہ" ڈرائیور نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"شرف الدین تم فوراً گاڑی لے کر صاحب کے دفتر پہنچو۔ میں انہیں فون کرتی ہوں" بیگم کمال اُلجھے ہوئے انداز میں فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں اور ڈرائیور تابعداری سے سرہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

"خیر تو ہے ناں کمال صاحب؟" ڈی آئی جی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"خیر ہی تو نہیں ہے صادق صاحب! گھر سے فون آیا ہے کہ ماجد اسکول سے غائب ہوگیا ہے۔" کمال صاحب کے لہجے میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔

"یہ تو بہت افسوس ناک خبر سنائی ہے آپ نے؟ آپ مجھے تمام بات بتائیں۔"

جواب میں کمال صاحب نے تمام واقعہ ان کے گوش گزار کردیا۔

"کمال صاحب یہ اغوا کا آٹھواں کیس ہے جو صبح سے اب تک ہمارے علم میں آیا ہے۔"

"کیا اور بھی....."

"جی ہاں! شہر کے مختلف پولیس اسٹیشنز میں اغوا کی سات ایف آئی آر درج کرائی جاچکی ہیں۔ شہر کے تمام پولیس اسٹیشنز کو اس سلسلے میں الرٹ کردیا گیا ہے اور اب آپ کے بیٹے کے متعلق بھی اطلاع کرادیں گے..... آپ پریشان نہ ہوں..... حوصلہ رکھیں..... انشاءاللہ ہم جلد ہی بچوں کو تلاش کرلیں گے اور..... مجرموں کو ایسی سزا دیں گے کہ وہ ساری عمر یاد کریں گے" ڈی آئی جی کے لہجے کا کوکھلاپن کوشش کے باوجود چھُپ نہیں رہا تھا۔

"صادق صاحب!..... میرا ایک ہی بیٹا ہے....." کمال صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

☆ --- ☆ --- ☆

ماجد کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں موجود پایا۔ وہ کافی دیر تک یوں ہی چُپ سادھے پڑا رہا اور پھر جوں جوں اس کے حواس بحال ہوتے گئے اسے بیتی ہوئی سب باتیں ایک ایک کرکے یاد آتی گئیں۔

اسکول ..... ریس کی گھنٹی ..... اور پھر کھیل کے دوران دوستوں سے جُدا ہو کر تتلی کے تعاقب میں اسکول کے عقب میں واقع سڑک پر جانا..... ایک سرخ رنگ کی کار کا اس کے نزدیک زور سے بریک لگا کر رکنا..... اس میں موجود خوفناک صورت سواروں میں سے ایک کا پھُرتی سے باہر نکلنا اور اسے دبوچ کر پچھلی سیٹ پر پھینکنا

..... اور جیب سے کوئی چیز نکال کر اس کے منہ پر رکھ کر دبانا..... اور پھر کار کو تیزی سے دوڑانا اور اس کے ذہن کا اچانک تاریکیوں میں ڈوب جانا ..... اس کے بعد کیا ہوا؟ اسے کچھ یاد نہ تھا!

"یہ لوگ کون ہیں؟ اور مجھے کیوں اغوا کر کے لائے ہیں؟ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ کیا چاہتے ہیں؟ .. .... اس وقت .. .... میں کہاں ہوں؟" سوچتے سوچتے اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں اور اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

اسی لمحے اچانک کوٹھری کا دروازہ ایک زور دار جھٹکے سے کھلا اور ایک کریہہ صورت شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔

"یہ ..... یہ تو وہی ہے ..... جس نے مجھے کار سے اُتر کر پکڑا تھا!" ماجد نے سہم کر سوچا۔

"چلو" آنے والے کی آواز میں بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔

"ک ..... کک ..... کہاں؟" ماجد نے تھر تھر کانپتے ہوئے پوچھا۔

"خبردار ..... بولنے کی ضرورت نہیں ..... خاموشی سے ساتھ چلو"

اس نے غراتے ہوئے ماجد کو گردن سے دبوچ لیا اور اسے ساتھ لئے کوٹھری سے باہر آگیا۔ دو تین کمروں سے گزرتے ہوئے وہ باہر سڑک پر آگئے۔

سامنے وہی سرخ رنگ کی کار کھڑی تھی۔ اس نے انتہائی بے دردی سے ماجد کو کار کی پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا اور خود اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کار کا ڈرائیور برق رفتاری سے کار کو نامعلوم منزل کی طرف دوڑانے لگا۔

☆ --- ☆ --- ☆

وہ ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا۔ جس کے عین وسط میں رکھی میز کے گرد بچھی کرسیوں پر وہ چاروں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک تھری پیس سوٹ اور سر پر ہیٹ پہنے ہوئے تھا اور شکل سے غیر ملکی دکھائی دے رہا تھا۔

"مسٹر بلیک کوبرا! .....مال کب تک پہنچا رہے ہو؟..... اب تو مارکیٹ ویلیو بھی خاصی بڑھ چکی ہے۔ اب کی بار تو تم سر سے پاؤں تک نفع ہی نفع میں رہو گے ..... آہاہاہاہاہاہا" ہیٹ والے نے کہتے کہتے زور دار قہقہہ لگایا۔

"میرے لوگوں کے کام کی رفتار آج کل تیز رفتاری سے جارہی ہے مسٹروی"

"تمہیں سرخ مال اور دوسرے آئیٹم کل رات بارہ بجے تک "بی" پوائنٹ پر پہنچادیئے جائیں گے" مکروہ شکل والے نے، جسے غیر ملکی نے بلیک کوبرا کہہ کر مخاطب کیا تھا، اپنے سامنے رکھے کاغذ سے نظر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم بتاؤ

کاغذی مال کتنا لائے ہو؟"

"مال! بہت!!" مسٹروی نے اپنے پہلو میں رکھے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کتنے ہیں؟" بلیک کوبرا کی آنکھیں بریف کیس میں سجی نوٹ کی گڈیاں دیکھ کر ہوس سے پھیلتی چلی گئیں۔

"پورے ساٹھ لاکھ ..... گن سکتے ہو!" مسٹروی نے بریف کیس بلیک کوبرا کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

"اسکورپین! وائپر!" بلیک کوبرا نے اپنے دائیں بائیں بیٹھے کارندوں کو مخاطب کیا "رقم گن کر لاک کردو اور اس کے بعد تم دونوں فوری طور پر "پوائنٹ پر پہنچو ..... اور ..... اپنی نگرانی میں کام مکمل کراؤ ..... ہم اپنے دوست مسٹروی کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرانا چاہتے ..... اوکے .....اب تم لوگ جاسکتے ہو۔"

اس کا اشارہ پاتے ہی اسکورپین نے بریف کیس اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وائپر بھی اس کے ساتھ تھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

"ماجد کے ابا ..... کچھ پتہ چلا میرے ماجد کا؟" بیگم کمال نے بوجھل قدموں سے کمرے میں جاتے ہوئے کمال صاحب سے پوچھا۔ ان کے لہجے سے بے تابی جھلک رہی تھی۔

"نہیں! کمال صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"پولیس والے کیا کہتے ہیں؟"

"اپنی طرف سے تو وہ پوری کوشش کررہے ہیں ..... میں خود بھی سڑکوں پر ماجد کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ لیکن پتہ نہیں میرا بیٹا کہاں گیا ہے؟ ..... کہاں چلا گیا ہے؟ ..... ملتا ہی نہیں مجھے" کمال صاحب آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔

"آپ کو خبر ہے آج پورے تین دن ہوگئے ہیں ..... میرے ماجد کو گئے ہوئے ..... پتہ نہیں میرا لال کس حال میں ہوگا؟ ..... کہاں ہوگا؟ ..... کیسا ہوگا؟"

کہتے کہتے بیگم کمال کی آواز بھرا گئی اور پھر ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیں۔ روتے روتے اچانک انہوں نے پاگلوں کی طرح ہنسنا شروع کردیا اور پھر یکدم وہ بے جان سی ہو کر صوفے پر ایک طرف لڑھک گئیں۔

☆ --- ☆ --- ☆

وہ کُل بیس لڑکے تھے۔ جو ایک قطار کی شکل میں ایک کمرے سے نکل کر راہداری میں دھیرے لڑکھڑاتی چال چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ان کے چہرے مُرجھائے ہوئے تھے..... آنکھیں سوجی ہوئیں جیسے کئی راتوں سے مسلسل جاگتے رہے ہوں..... انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے جسموں سے لہو نچوڑ لیا گیا ہو..... سب کی عمریں ۱۴ سے ۱۶ سال کے لگ بھگ تھیں۔ ماجد کی حالت ان سب میں بُری تھی۔ وہ بڑی مُشکل سے قدم اُٹھا رہا تھا۔

"رُک جاؤ!" اچانک قطار کے آگے چلتے ہوئے قوی ہیکل شخص نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے گرجدار آواز میں حکم دیا۔ تمام لڑکے چلتے چلتے سہم کر جہاں تھے وہیں رُک گئے۔

ایک ہلکی سی سیٹی کی آواز سنائی دی اور ان کے سامنے موجود بڑا سا دروازہ خودکار سسٹم کے تحت نہایت آہستگی سے ایک طرف سرک گیا۔ کمسن قیدیوں کے ساتھ چلنے والے پانچ میں سے تین آدمی اندر داخل ہوگئے اور بقیہ دو، قطار کے دونوں سروں پر چوکس کھڑے ہوگئے۔ دروازہ اب بند ہوچکا تھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

"ڈاکٹر صاحب!" کمال صاحب نے ایمرجنسی روم سے باہر آتے ہوئے ڈاکٹر کی طرف بڑھے۔

"مسٹر کمال آپ پریشان نہ ہوں آپ کی بیگم کی زندگی اب خطرے سے باہر ہے لیکن ان کا ذہن مُتاثر ہوچکا ہے۔ سنبھلنے میں کچھ وقت لگے ..... صدمہ کافی گہرا ہے"

ڈاکٹر نے ان کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں انہیں دیکھ سکتا ہوں؟"

"جی ہاں ..... کیوں نہیں ..... آپ ان سے مل سکتے ہیں لیکن کوئی بات نہ کیجئے گا"

"رائٹ سر" کمال صاحب نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا اور تھکے تھکے قدموں سے ایمرجنسی روم میں داخل ہوگئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا۔ قطار میں موجود لڑکوں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی تھی۔ جو لڑکا بھی اندر جاتا پھر لوٹ کر باہر نہ آتا تھا۔ اس صورت حال سے ہر لڑکے کا ذہن ناقابل اذیت سے دوچار تھا۔

"تھرٹین نمبر..... چلو اندر" دروازے پر کھڑا خوفناک شکل شخص ماجد سے مخاطب تھا اور پھر ماجد کو بھی اس نے دوسرے لڑکوں کی طرح بڑی بے دردی سے پکڑ کر دروازے سے اندر دھکیل دیا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد ماجد چند لمحوں تک گُم سُم کھڑا رہا اور پھر جوں ہی اس نے نگاہیں اُٹھا کر سامنے دیکھا اسے اپنا لہو رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں اور پسینے میں شرابور جسم

خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔ اس نے اتنا بھیانک اور ہوش رُبا منظر زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں رکھی میز پر اس سے پہلے اندر آنے والے لڑکوں کے کٹے سر ترتیب سے رکھے تھے۔ چہروں سے آنکھیں غائب تھیں اور گردنوں سے رستا ہوا تازہ تازہ خون میز کے کناروں سے نیچے گر کر بڑے سے دائرے کی شکل میں جمع ہو رہا تھا۔ میز سے چند قدم آگے تمام لڑکوں کے دھڑ رکھے ہوئے تھے۔ جن کا پیٹ اور سینہ انتہائی سفاکی سے چاک کر دیا گیا۔ ماجد نے گھبرا کر جوں ہی دوسری طرف دیکھا اس کو سانس حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا ..... وہاں بڑے بڑے شیشے کے مرتبان رکھے تھے جن میں بھرے ہوئے خاص قسم کے محلول میں دل اور گُردے تیر رہے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد ماجد کے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ اس کے منہ سے ایک دل ہلا دینے والی فلک شگاف چیخ نکلی اور وہ چکرا کر فرش پر گر پڑا۔

اسی لمحے کمرہ سفید لباس میں ملبوس تینوں افراد کے ڈراؤنے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سی بد روحیں مل کر چیخ رہی ہوں!!!

☆ --- ☆ --- ☆

"ٹررررن..... ٹررررن..... ٹررررن"

فون کی گھنٹی بجتے ہی بلیک کوبرا نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا

"ہیلو..... بلیک کوبرا اسپیکنگ ..... کیا رپورٹ ہے؟"

"باس میں وائپر بات کر رہا ہوں..... بیس کو ٹھکانے لگا کر مال تیار کرلیا گیا..... اور کچرا دریا میں بہا دیا گیا ہے" دوسری طرف سے کہا گیا۔

ویری گڈ..... ایکسیلنٹ!..... ٹھیک ہے ..... اب تم ایسا کرو کہ ہر آئیٹم کی علیحدہ علیحدہ پیکنگ کراؤ اور ..... رات ٹھیک بارہ بجے ..... تم نے اسکورپین کے ساتھ یہ مال لے کر پوائنٹ "بی" پر پہنچنا ہے وہاں ریڈ گروپ تمہارا منتظر ہوگا ..... اور ہاں دو تین لاکھ ساتھ لیتے جانا رستے میں "خریداری" کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کام بہت رسکی ہے۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ انڈر سٹینڈ"

ڈاؤنٹ وری اباؤٹ اٹ سر! آپ کو رات بارہ بج کر پچاس منٹ پر او کے رپورٹ مل جائے گی۔"

--- ☆ ---☆

صبح ہوتے ہی شہر کی زندگی جاگ اُٹھی۔ ملازمت پیشہ لوگ اپنے اپنے دفتروں کو جا رہے تھے اور بچے اسکولوں کی طرف رواں دواں تھے۔ ایسے میں بلیو اسکائی پبلک اسکول کے مین گیٹ

کے سامنے ایک سبز رنگ کی کار آکر رکی۔ اس میں سے ایک خاتون اُتری۔ جس کا لباس میلا کچیلا تھا بال بکھرے ہوئے اور چہرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دُکھوں کی کئی تہیں اس پر سجادی گئی ہیں۔

"بیٹا بات سنو" خاتون نے گیٹ سے اندر جاتے ہوئے بچے کو پکارا "جی آنٹی!" بچہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا

بیٹا تم نے میرے ماجد کو دیکھا ہے؟..... وہ بھی اسی اسکول میں پڑھتا ہے نا تمہارے ساتھ" ..... تم نے اسے دیکھا ہے؟" خاتون بچے کا ہاتھ تھامے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

جی نہیں آنٹی" بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اچھا!" خاتون کچھ سوچتے ہوئے بولیں "میں .....یہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی ہوں..... وہ بس آنے ہی والا ہوگا...."

بچہ کندھے اچکاتا ہوا گیٹ سے اندر چلا گیا اور وہ خاتون وہیں گیٹ کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

☆ --- ☆ ---☆

"سر یہ رہی بچوں کے اغوا کے کیس والی فائل"

"اسے تو اب داخل دفتر ہی کردیں آپ ..... میرا ٹرانسفر لیٹر آگیا ہے میں کل جارہا ہوں۔" ڈی آئی جی صاحب نے کہا اور سر پر ٹوپی سجا کر دفتر سے باہر نکل گئے۔

☆ --- ☆ ---☆

سفید رنگ کی کار اسکول کے گیٹ کے سامنے آکر رُکی۔ اس میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی نکلا۔ بڑھی ہوئی شیو اور جُھکے ہوئے کندھوں سے وہ کوئی بوڑھا آدمی معلوم ہورہا تھا۔ دُکھ اور اُداسی کی گہری چھاپ اس کے دھواں ہوتے ہوئے چہرے سے عیاں تھی۔ کار کا گیٹ بند کرنے کے بعد وہ تھکی تھکی سی چال چلتا ہوا گیٹ کے قریب بیٹھی پریشان حال خاتون کی طرف بڑھنے لگا۔

"چلو بیگم ! شام ہونے والی ہے اور آؤ اب گھر چلیں" اس نے خاتون کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"شام!..... کیا صبح نہیں ہوگی؟" خاتون نے دور خلاؤں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے خود کلامی کی "کیا میرا ماجد نہیں آئے گا؟"

اور پھر وہ اس شخص کا گریبان پکڑ کر ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

ماں کے سوال کا جواب اس باپ کے پاس نہ تھا جو نمناک آنکھوں سے بے حس معاشرے کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ہر شخص اپنی دھن میں مگن نظر آرہا تھا.....!!

کرکٹ کے میدان میں جاوید کا ایک روپ اور

میانداد جنید میانداد کو کرکٹ کے اسرار و رموز سکھا رہے ہیں

مولا بخش

دیکھو! جب کیچ پکڑتے ہیں تو دونوں ہاتھ اس طرح جوڑتے ہیں۔

ابو بہت گرمی ہے میں تو تھک گیا!!

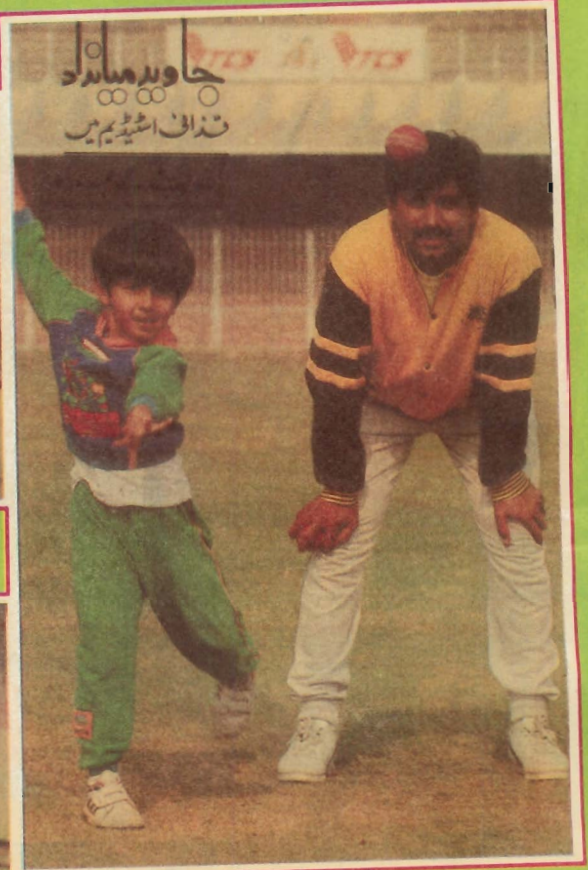

دیکھئے ابو! مشتاق انکل گگلی اس طرح کراتے ہیں!!

وہاں سامنے باؤنڈری پر تمہیں کھڑے ہونا ہے

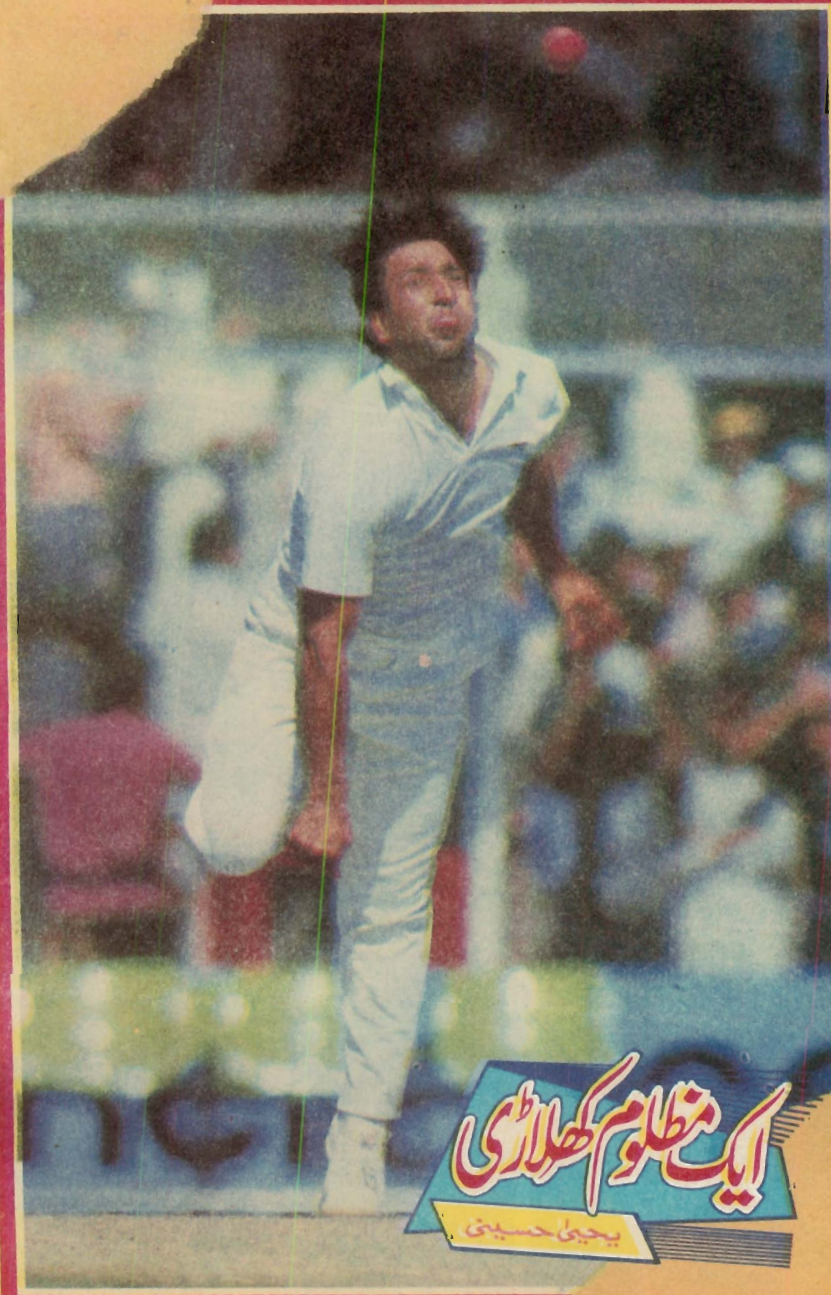

ایک مظلوم کھلاڑی

یحییٰ حسینی

دُنیائے کرکٹ میں آج کل آسٹریلین لیگ اسپنر شین وارن' کی بالنگ کا چرچا ہے اپنی گھومتی ہوئی دلفریب لیگ اسپین بالنگ سے بیٹسمینوں کو پریشانی میں مبتلا کرنے والے وارن کے ہم عصر بھارت کے کمبلے اور پاکستانی بالر مشتاق احمد ہیں۔ لیکن لیگ بریک' فلیپر' گگلی کرنے والے یہ تینوں بالر آج بھی مشرق کے جادوگر کے نام سے شہرت رکھنے والے مشہور زمانہ لیگ اسپنر عبدالقادر جیسی کارکردگی نہیں دکھا سکے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ بالر ابھی اتنے تجربہ کار نہیں ہوئے ہیں اور ..... ویسے بھی ہر کھلاڑی کا اپنا ایک انداز اور اسٹائل ہوتا ہے جو کہ کھیل کے میدان میں اسے اپنے ہم عصر کھلاڑیوں سے ممتاز کرتا ہے۔

لیگ اسپین بالنگ کرکٹ کا مشکل آرٹ ہے یہی وجہ ہے کہ اس فیلڈ یا اس قسم کی بالنگ میں کم ہی کھلاڑیوں نے طبع آزمائی کی۔ ۱۹۷۷ء میں عبدالقادر کے روپ میں آسمان کرکٹ پر ایک ایسا لیگ اسپنر نمودار ہوا جس کی آمد سے لیگ اسپین بالنگ کے تنِ مُردہ میں گویا جان سی پڑ گئی پھر قادر خود بھی لیگ اسپین کے آرٹ کا ایک عظیم ترین شاہکار بن کر اُبھرے' اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کے ہر طرف انہی کی بالنگ کے چرچے ہونے لگے۔ منفرد اسٹائل اور اپنی کلائی کے زور سے اپنی نوعیت کی منفرد لیگ اسپین بولنگ کرانے والے عبدالقادر کو کرکٹ کا جادوگر کے نام سے پکارا جانے لگا' قادر کے جادو کا توڑ بیٹسمینوں کی اوّلین ترجیح بن گیا لیکن باوجود تمامتر کوششوں کے وہ قادر کا توڑ نہ کر سکے اور یوں رنزوں کے انبار لگانے والے بیٹسمین قادر کے سامنے یوں بے بس ہو گئے جیسے وہ کھیلنا ہی نہ جانتے ہوں۔ یوں قادر کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا اور دنیائے کرکٹ کی تمام ٹیمیں قادر کا سامنا کرنے کے لئے خاص حکمت عملی اختیار کرنے لگیں۔ لیکن جب باوجود کوشش کے وہ قادر کے خلاف کوئی مثبت حکمت عملی ترتیب دینے میں ناکام رہے تو انہوں نے عبدالقادر کو دُنیا کا صفِ اوّل کا اسپین بالر تسلیم کر لیا۔ عبدالقادر نے پاکستانی ٹیم کی بیشتر فتوحات میں کلیدی کردار ادا کیا یہی نہیں انہوں نے بارہا اپنے بلے سے پاکستان کو مطلوبہ نتائج کے حصول میں خاصی مدد بھی دی بحیثیت مجموعی قادر نے اپنے آپ کو ایک مکمل اسپنر کی حیثیت سے منوایا مگر اچانک ہی خوش قسمتی قادر سے روٹھ گئی اور قادر کا کیریئر بدقسمتی کا شکار ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۹۱ء میں آکسبرج (انگلینڈ) میں ایک امدادی میچ کھیلنے کے دوران اچانک ہی وہ گیند کرانے کے لئے دوڑتے ہوئے گر پڑا۔ یہ بالکل ایسا ہی احساس تھا

کہ جیسے الیکٹرک کا کرنٹ اچانک جسم میں سرایت کرجائے اور جب یہ اثر چند لمحوں کے بعد ختم ہوا تو قادر کی ٹانگ بے جان ہو چکی تھی۔ اور اس کی وجہ اس رگ کا ٹوٹ جانا تھا جو کہ ایڑی اور ٹانگ کو جوڑے رکھتی ہے' فوری طور پر انہیں اسپتال لے جایا گیا اور ان کی ٹانگ آپریشن کے بعد پلاسٹر میں جکڑ دی گئی۔ یوں عبدالقادر مہینوں کے لئے بستر پر پڑے رہنے پر مجبور ہوگئے قادر کی عدم موجودگی میں پاکستانی ٹیم نے اس کھلاڑی کی کمی شدت سے محسوس کی دوسری جانب ایک طویل عرصے کرکٹ کی دنیا سے دور رہنے کے بعد جب اس کھلاڑی نے صحت یاب ہونے کے بعد دوبارہ ٹیم میں شمولیت اختیار کرنا چاہی تو اس محب وطن کھلاڑی کی ماضی کی کارکردگی کو یکسر فراموش کردیا گیا۔ اور اسے فٹ ہونے کے باوجود اب تک اسے ٹیم سے دور رکھا گیا ہے حالانکہ قادر اب بھی کھیلنے میں بھرپور دلچسپی رکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ اسپنر کی کسی بھی ٹیم میں بڑی اہمیت ہوتی ہے اور انگلینڈ اور آسٹریلیا نے طویل عمر کے اسپنرز کو کئی مواقع پر بار بار ٹیم میں شامل کیا اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا۔

عبدالقادر نے ٹیسٹ کرکٹ میں ۱۰۲۹ رنز بنانے کے ساتھ ۲۳۶ وکٹیں بھی لے رکھی ہیں۔ جبکہ ون ڈے کرکٹ میں ۶۴۱ رنز اور ۱۳۲ وکٹیں ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ اتنے اچھے ریکارڈ رکھنے والا عبدالقادر آج حسرت و یاس کی تصویر بنا ہوا ہے قادر کو بجا طور پر ہم ایک مظلوم کھلاڑی کہہ سکتے ہیں جسے عمدہ کارکردگی اور تجربے کے باوجود مسلسل نظرانداز کیا جارہا ہے!!

متوازن غذا
صحت کی ضامن

ماہرین غذائیت' غذاؤں کو درج ذیل چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں

- سبزیاں، پھل اور فروٹ
- اناج، چاول، گندم اور دالیں وغیرہ
- دودھ، مکھن، گھی، پنیر اور دہی وغیرہ
- گوشت' انڈے، مرغی اور مچھلی وغیرہ

اگر آپ نے دن بھر کی غذاؤں میں ان چاروں حصوں سے کچھ نہ کچھ چکھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے متوازن غذا کھائی اور آپ کے جسم کو مطلوبہ توانائی میسر آگئی۔

اشتہار برائے ترغیب حفظان صحت و تندرستی اطفال - آنکھ مچولی

شیر جنگل کا بادشاہ کے نتائج

دُرست جوابات :

جواب نمبر۱ : ٹائیگر جنوبی ایشیا کے گرم جنگلوں میں سرسبز میدانوں میں پائے جاتے ہیں، کچھ ٹائیگر سرد علاقوں میں بھی پرورش پاتے ہیں۔

جواب نمبر۲۔ ٹائیگر جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں، سرد علاقوں کے ٹائیگر مچھلیاں اور کچھوے بھی شوق سے کھاتے ہیں۔

جواب نمبر۳۔ گرم موسم میں ٹائیگر اپنا جسم ٹھنڈا رکھنے کے لئے نہاتے ہیں۔

جواب نمبر۴۔ ٹائیگر کے بچے غار کے اندر جھول میں یا درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان محفوظ جگہ میں تین یا چار تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔

بذریعہ کوپن بالکل دُرست جوابات ارسال کرنے والے ساتھی :

محمد اویس عالم، اوکاڑہ۔ فاطمہ احمد، کراچی۔ محمد نوید، ہری پور۔ ذیلخان سولنگی، گڈو (سندھ) طاہرہ احمد، رحیم یار خان، ناصر منظور، نوابشاہ۔ دُر دیباج، مظفر گڑھ۔ عبدالقدیر خان، رحیم یار خان۔ حمیر عباس، بہاولپور۔ سیّد احمد رضا، کراچی۔ اُسامہ سلیم شیخ، جہانیاں منڈی۔ عمرانہ حسن، ہارون آباد۔ ریاض احمد، پسنی۔ ارشد نواز کوہاٹ شہر۔ رضوان حیدر، اسلام آباد۔ بلقیس مریم(؟) بسمہ سعید، چکوال۔ زنیرہ سحاب، کشمور۔ شبانہ انوار، حیدر آباد۔ سیّدہ افشاں افتخار، کراچی۔ محمد جاوید، ضلع بھکر۔ سائرہ ممتاز، کراچی۔ شازیہ اسلم، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سیّد قاسم جان، مردان۔ عنبر حسن ثنا، کراچی۔ سمیعہ حق، اسلام آباد۔ ثمرین فاطمہ جھنگ صدر۔ سائرہ تبسم، جہلم۔ حِنا خان، راولپنڈی۔ شیر نواز گل، پشاور۔ سدرۃ المنتہیٰ خوشاب۔ محمد عقیل، واہ کینٹ۔ محمد ابراہیم خان، کراچی۔ محمد عماد، حیدر آباد۔ شاہ زیب محمد، کراچی۔ محمد اطہر۔ حب (بلوچستان)۔ مونا اقبال، کراچی۔ بینا عمر، حیدر آباد۔

بذریعہ قرعہ اندازی انعام حاصل کرنے والے تین خوش نصیب :

۱۔ سیّد قاسم جان، مردان۔ ۲۔ سائرہ ممتاز، کراچی۔ ۳۔ شبانہ انوار، حیدر آباد۔

ننھا اجیر

عمارہ احمد

دُکانوں میں سجے سارے کھلونے کتنے پیارے ہیں!
وہ بھالو اور یہ گڑیا جس کے کپڑوں پر ستارے ہیں!!
یہ اک گُڈّا سپاہی رات دن ڈیوٹی پہ رہتا ہے!
میں جب شوکیس کے پاس آکے اس کو دیکھتا ہوں.....
مجھ سے کہتا ہے......
چلو ہم دوستی کرلیں!
چلو ایسا کرو تم مجھ کو اپنے ساتھ لے جاؤ!
تو ہم تم ساتھ کھیلیں گے.....
مجھے تم پیار سے رکھو گے یہ معلوم ہے مجھ کو!!
نہیں تم نے خریدا اگر.......
تو پھر مجھ کو کوئی شیطان کے خالو خریدیں گے!!
کبھی کھینچیں گے وہ ٹانگیں مری اور ہاتھ توڑیں گے
مگر میں اپنے اس گُڈّے سپاہی دوست سے......
یہ کہہ نہیں سکتا......
کہ میں تو خود بھی اک گُڈّا کھلونا ہوں!
کہ میں بھی رات دن ڈیوٹی پہ رہتا ہوں!!
کبھی ابا کی ڈانٹیں اور کبھی اُستاد کی باتیں!
یہ سارے رنج سہتا ہوں!!
صبح بس مجھ میں چابی بھر کے جیسے چھوڑ دیتے ہیں!
تو میں بس شام تک حرکت میں رہتا ہوں!!

کبھی میں دل ہی دل میں کتنے پُرزے جوڑ کر.....
بطخ بناتا ہوں!
کبھی اُستاد کی نظروں سے بچ کر.....
گاڑیوں کے تار سے گڑیا بناتا ہوں!
پھر اس کے ٹاٹ کے کپڑوں پر مٹی سے بنے تارے لگاتا ہوں
مگر اُستاد کی ڈانٹیں
کبھی سپنے سہانے توڑ دیتی ہیں!
مری سوچوں کا دھارا موڑ دیتی ہیں!!
تو میں پھر سے الجھ جاتا ہوں جا کر اِنجنوں میں، ان کی تاروں میں
تو دِل کرتا ہے میرا لے کے اپنے دوست اس گُڈّے سپاہی کو
چلا جاؤں میں غاروں میں!
جہاں کوئی بھی ہم کو ڈھونڈ نہ پائے.....
مگر یہ ساری باتیں میرے جیسا بے زباں گُڈّا کھلونا
کس کو سمجھائے.....؟
اور اب ایسا ہے میرے ساتھ کہ چُھپ کر.....
کوئی بطخ ہی نہ گڑیا بناتا ہوں!!
میں اب تو اور ہی اک گیت گاتا ہوں!
کسی سے کچھ نہیں کہنا.....
مجھے اب اور زیادہ دن نہیں اس قید میں رہنا.....
بہت جلدی میں اک گاڑی، "اُڑن گاڑی" بنالوں گا!
اور اس کے بعد پیارے دوست تم کو
قید سے، آکر چھڑالوں گا!
تو ہم اُڑ جائیں گے دونوں.....
بہت اوپر جہاں اونچے ستارے ہیں!!

اس طرح تو ہوتا ہے

محمد خرم معراج

ڈھلتے سورج کے ساتھ میں نے بھی اپنے اڈے کی راہ لی۔ صبح جب موسم نے اپنا رنگ بدلا تھا تو ہلکی پھلکی پھوار پڑ رہی تھی میں دیر تک لیٹا رہا تھا اور موسم کا لطف اٹھاتا رہا تھا مگر جیرا بلیڈ کے ایک ہی ہنٹر نے مجھے اُٹھنے پر مجبور کردیا۔ وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ کام کے معاملہ میں اپنے باپ سے بھی رعایت نہیں کرتا۔ دل پر جبر کرتے ہوئے دھندے پر نکلا مگر مارکیٹ میں مندی کا رجحان تھا اس لئے پورے دن میں صرف ایک "شکار" ہاتھ لگا۔ شکار کی کمائی گننے کے لئے ایک منڈیر کا انتخاب کیا جس کے اطراف کی گلیاں سُنسان تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں نے بٹوہ کھولا۔ شناختی کارڈ پر سمیع الدّین احمد کا نام درج تھا۔ پریس کارڈ سے اندازہ ہوا کہ وہ صحافی تھا۔ ان دو کارڈوں کے علاوہ بٹوے میں صرف تین سو روپے تھے۔

"ہونہہ ..... یہ آج کل کے صحافی بھی بڑے کنگال ہیں' چلو اسی بہانے اخبار میں ہماری واردات کی خبر آجائے گی" میں نے کارڈ اور پیسے اپنی جیب میں رکھے اور خالی بٹوہ ایک طرف پھینک دیا۔ مارٹن روڈ کی طرف پتلی گلیوں سے نکلتے ہوئے میں نے بھاگتی ہوئی ٹریفک پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ "آہ ..... ہر شخص اپنی زندگی میں مگن ہے ..... زندگی کی شاہراہ پر کوئی نہیں رُکتا ..... ایک ہم ہیں! ..... صبح شام جیب کترنا' لوگوں کو ان کی حلال کمائی سے محروم کرنا اور پھر تھک ہار کر سوجانا ہونہہ ..... یہ بھی کوئی زندگی ہے!!..... اس سے تو مرجانا بہتر ہے۔"

میں اپنے آپ کو لعن طعن کررہا تھا۔ کم مائیگی کا ایک جھونکا میرے اندر سرایت کر گیا۔ سورج گہرے سیاہ بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔ شاید میری بے بسی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ میں نے اپنے بے جان قدم مارٹن روڈ کی طرف بڑھا دیے۔ ماضی کے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہوگئے تھے۔ ایک ماں تھی' ایک باپ تھا۔ ان دنوں مجھے کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ اسکول سے بھاگنا اور شمس الدین کے باغ سے آم توڑنا میرا روز کا معمول تھا۔ بڑے سنہرے دن تھے مگر ابا بڑے ناراض ہوتے تھے۔ ایک بار اسکول سے بھاگنے پر انہوں نے مار مار کر میری ہڈی پسلی ایک کردی۔ میں بڑے لاڈ پیار میں پلا تھا' یہ ستم برداشت نہ کرسکا اور اسی رات آنسو بہاتا ہوا گھر سے بھاگ نکلا۔ مجھے یاد ہے کہ اس رات میرے دوست راجو نے مجھے جیرا بلیڈ سے ملوایا تھا وہ بیک وقت درجنوں اڈے چلاتا تھا اور سینکڑوں جیب کترے اس کے شاگرد تھے۔ اس نے مجھے جیب کاٹنے کا فن سکھایا۔ آج یہی میری زندگی ہے۔ میں اپنے آٹھ سالہ کیریئر میں ایک بار بھی نہیں پکڑا گیا۔ آج میں ۲۳ سال کا کڑیل نوجوان ہوں۔ مگر میری یہ جوانی کس کام کی؟

میرے ماں باپ میرے جُدائی کے غم میں اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔

لوگ مجھے جیب کترے کے نام سے جانتے ہیں اور حقارت سے دیکھتے ہیں میری شامیں پھیکی ہیں۔ دن اور رات میرے لئے ایک جیسے ہیں۔

کاش! کوئی مجھے میرے ماں باپ دلوا دے

"اندھا ہے کیا ..... سامنے دیکھ کر نہیں چلتا؟" میں بے خیالی میں کسی امیرزادے سے ٹکرا گیا تھا جو مجھ پر برس پڑا۔

"اب دیکھتا کیا ہے ..... سامنے سے ہٹ!!" وہ کپڑے صاف کرتا ہوا ہتھوڑے برساتا ہوا آگے نکل گیا۔ میرے قدم من من بھر وزنی ہوگئے۔ اس لمحے کمتری کا احساس شدید تر ہوگیا ماں باپ بڑی شدت سے یاد آئے۔ بوجھل

قدموں سے ملّت ٹاؤن جانے والی بس میں سوار ہوگیا۔ میری سوچوں کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کسی خوشگوار فیصلہ پر پہنچتا ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی "کیا آپ میرے بیٹھنے کے لئے تھوڑی جگہ دے سکتے ہیں ..... بہت دیر سے کھڑا ہوں۔"

وہ نسبتاً میلے کپڑوں میں ملبوس ۱۲ - ۱۵ برس کا لڑکا تھا۔ "ٹھیک ہے" میں نے اسے جگہ دیتے ہوئے کہا "تم بیٹھ سکتے ہو" اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ "پڑھتے ہو!" میں نے اس کا سرسری جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

"یہ کتاب میرے دوست نے مجھے دی ہے کیونکہ خریدنے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"کہیں کام بھی کرتے ہو؟"

"جی نہیں..... میری ماں کہتی ہے کہ پڑھنے لکھنے کے لئے بہت سارا وقت چاہئے۔ اگر میں کہیں کام پر لگ گیا تو پڑھ نہیں سکوں گا۔"

ماضی کے واقعات فلم کی طرح میرے دماغ میں گھوم گئے۔ میری ماں بھی مجھے یہی نصیحت کرتی تھی جسے میں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ "اور کیا کہتی ہے تمہاری ماں؟" میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔

"ماں بہت ساری نصیحتیں کرتی ہے اور میں ان پر عمل کرتا ہوں۔"

وہ بچہ مجھے فرشتہ معلوم ہورہا تھا۔ "مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے۔" میں نے سوچا لیکن ضمیر کی آواز نے کہا۔ "حرام پیسوں سے کسی کی مدد نہیں کی جاسکتی۔ حرام تو حرام ہوتا ہے۔"

میں نے فیصلہ کرلیا کہ بس سے نکلتے ہی حرام پیسہ کو دریا برد کردوں گا اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے بعد نئے سفر کا آغاز کروں گا۔"

ایک خوشگوار تبدیلی میرے وجود میں داخل ہونے کے لئے بے تاب تھی اس لمحے بس کی کھڑکی سے سورج کا بادلوں کی اوٹ سے جھانکنا اور بکھری ہوئی کرنیں بہت خوبصورت لگیں۔ میں اپنے آپ کو کارآمد انسان محسوس کرنے لگا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ میری حلال کمائی کے کیا طریقے ہوسکتے ہیں کہ اچانک وہ لڑکا تیزی سے اُٹھا "جی ..... میں چلتا ہوں ..... بس یہی اسٹاپ ہے میرا ..... آپ میرا کرایہ دے دیں ..... بڑی مہربانی" وہ پلک جھپکتے میں بس سے اُتر گیا۔ جلدی میں کتاب بھی چھوڑ گیا۔

"واقعی یہ فرشتہ تھا جس کی باتوں نے میری زندگی بدل دی۔"

"ہاں بھئی!! کرایہ ..... دو بندوں کا" بس کنڈیکٹر نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں نے پیسے نکالنے کے لئے اپنی داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر دل

دھک سے رہ گیا جیب میں کچھ نہیں تھا اور کٹی ہوئی جیب سے دوسری طرف نکلا ہاتھ میرا منہ چڑا رہا تھا۔

وہ معصوم فرشتہ جس نے میری زندگی میں کچھ دیر پہلے اپنی اچھی اچھی باتوں سے ایک انقلاب برپا کیا تھا میرا کام تمام کر گیا تھا۔

کنڈیکٹر ٹکٹ لینے پر اصرار کر رہا تھا اور میرے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہی تھی!!

کیا آپ ناراض ہیں؟

اگر آپ

- اس لئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیئے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑے بغیر لکھی گئی تھی۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جا رہی تھی؟
- چھوٹے پُرزوں پر لکھی گئی تھی؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں؟
- آپ کی تحریر کا اندازِ بیان، خیال اور اسلوب بچوں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا۔؟
- تو پھر سوچیئے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں۔
- یاد رکھیئے! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(ادارہ)

تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ممتاز حبیب صابری

یہ تصویر امریکہ اور ویتنام کی لڑائی کی ہے۔ ایک سوگوار باپ ایک جنگی مقتول بچے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ویتنامی رینجرز کو دکھا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ہزاروں سوال مچل رہے ہیں۔ میرا بچہ کیوں قتل ہوا؟ اس کا گناہ کیا ہے؟ اسے کس سے دشمنی تھی؟ فوجیوں کے چہروں سے بھی افسوس ظاہر ہو رہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ صرف افسوس کرنے سے بلکہ اب کچھ بھی کرنے سے یہ بچہ زندہ تو نہیں ہو گا بلکہ ہو سکتا ہے اس بچے کے انتقام میں چند اور بچے مر کھپ گئے ہوں۔ یہ تو ۱۹۶۴ کی بات ہے آج کل بھی بچوں کا بے دریغ قتل عام کیا جا رہا ہے!! یونیسیف کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق گزشتہ دس سالوں میں بچوں کا بے انتہا قتل ہوا۔ یہ قتل خاندانی دشمنی اور جنگوں میں ہوئے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ عشرے میں ۲۰ لاکھ بچے مارے گئے۔ یہ مقتول بچے ۲ لاکھ فی سال کے حساب سے قتل ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ۴۵ لاکھ معذور ہوئے۔ ایک کروڑ بیس لاکھ بچے بے گھر ہو گئے ہیں اور دس لاکھ سے زیادہ بچے یتیم یا والدین سے جدا ہو گئے ہیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اسی پر بس نہیں بلکہ تقریباً" ایک کروڑ بچے نفسیاتی عارضوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

یونیسیف نے اپنی رپورٹ میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ خاندانوں یا قبیلوں کے درمیان تنازعات میں بچے اتفاقیہ نہیں بلکہ قصداً" گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کو فوج میں بھرتی کیا جانے لگا ہے۔

حال ہی میں ۱۴ سال سے کم عمر کے ہزاروں بچوں نے سپاہی کے حیثیت سے جنگوں میں حصہ لیا اور ۲۵ جنگیں لڑیں!! کیا یہ بچوں پر ظلم نہیں ؟

ایک ننھی پری کی خواہش

سلیمیٰ وحید

یہ جہاں کیوں ان معصوموں پر رحم کرتا نہیں
یہ معصوم بچّے تاریکی میں ڈھل نہ جائیں کہیں
کون لُوٹ رہا ہے ان کے معصوم خوابوں کو
ان کا بچپن، تتلیاں ان کے جُگنو مر نہ جائیں کہیں
صیّاد انہیں آزادی سے جینے کیوں نہیں دیتا
یہ ظُلمی ہی کی چوکھٹ پہ مر نہ جائیں کہیں
معصوم سے چہرے ہیں، دل ان کے پیار کے ساگر
یہ ننھے پھُول ہیں، دُھوپ میں مُرجھا نہ جائیں کہیں

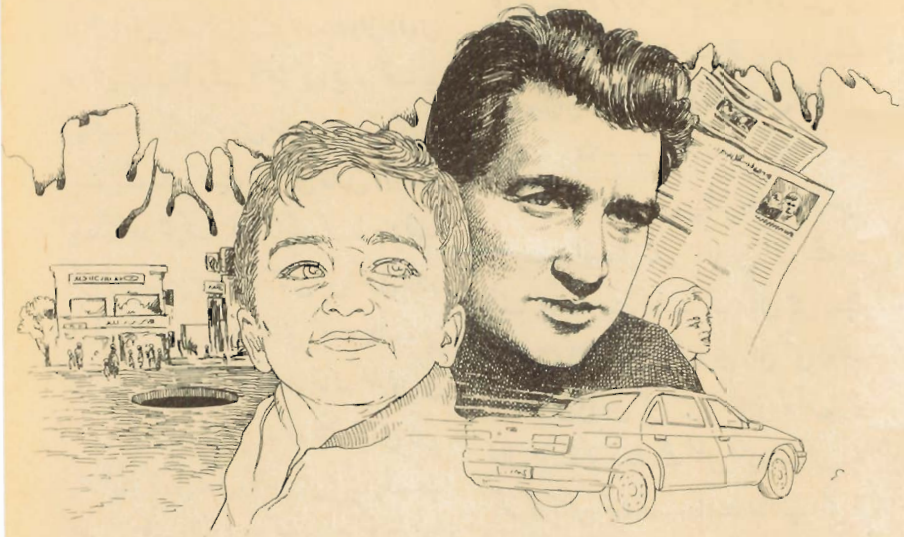

حادثہ

محمد منور صدیقی

زندگی کے کسی بھی موڑ پر کوئی بھی حادثہ رونما ہو سکتا ہے لیکن کچھ حادثے کسی کی نااہلی کے سبب ہوتے ہیں یہ کہانی ایک بڑے ادارے کی غفلت اور نااہلی کا پردہ اٹھا رہی ہے!!

نئے ماڈل کی سیاہ چمکدار ہنڈا اکارڈ شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ پیچھے سے کئی گاڑیاں کئی مرتبہ ہارن دے چکی تھیں اور کئی ایک اوورٹیک کر کے آگے بڑھ گئی تھیں لیکن ہنڈا اکارڈ کی رفتار بدستور وہی تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ کی کھڑکی پر ایک خوبصورت سا بچہ تقریباً باہر جھکا ہوا تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ اور سر کھڑکی سے باہر تھے اور وہ بڑی دلچسپی اور خوشی سے گزرنے والی دکانوں اور ان کے رنگا رنگ آئٹمز کو دیکھ رہا تھا۔ یہ نوید تھا۔ عمر تقریباً" نو دس سال۔ اس کے ممی پپا آگے بیٹھے تھے۔ ویسے تو انہیں طارق روڈ کے ایک مشہور شاپنگ سینٹر' شاپنگ کرنے جانا تھا۔ لیکن نوید کے پپا وجاہت حسین اپنی اکلوتی اولاد کی فرمائش کی وجہ سے گاڑی آہستہ چلانے پر مجبور تھے کیونکہ نوید نے دیکھ لیا تھا کہ کھلونوں کی دکانیں شروع ہو چکی ہیں۔ وہ چلتی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گزرتی ہوئی دکانوں میں اپنے پسند کے کھلونے دیکھ رہا تھا۔ اسے کھلونوں میں پسٹل اور بندوقیں وغیرہ بہت پسند تھیں۔

"پپا .....پپا ..... گاڑی روکیں۔ جلدی کریں ....." نوید نے ایک دم جوشیلے لہجے میں کہا۔

وجاہت صاحب نے کچھ کہے بغیر' مسکراتے ہوئے' گاڑی تھوڑا سا سائیڈ میں کر کے روک لی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ نوید کو کوئی "زبردست" قسم کی "گن" نظر آگئی ہوگی۔

نوید نے فوراً" ہی دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگائی۔ "ممی' پپا جلدی آئیں۔ وہ دیکھیں ..... کتنی زبردست کلاشنکوف ہے۔" اس نے ایک دکان کی طرف اشارہ کیا۔

جب وجاہت صاحب اور ان کی بیگم نے گاڑی سے اتر کر دکان کا رخ کیا تو نوید کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ فٹ پاتھ پر اور اس کے نیچے پیدل چلنے والوں کا ریلا رواں دواں تھا۔

☆ --- ☆ ---☆

تقریباً" بیس سال پہلے' وجاہت حسین کپڑے کی ایک مل میں معمولی سپروائزر تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ زندگی جیسے تیسے گزر ہی رہی تھی کیونکہ اولاد تو ان کی کوئی تھی نہیں۔ شادی کو تقریباً" نو سال ہونے کو آئے تھے لیکن ابھی تک ان کے گھر کا آنگن سُونا تھا۔ وجاہت صاحب ابھی تو جوان تھے لیکن اکثر پریشان ہو کر سوچا کرتے تھے کہ بڑھاپے میں ان کا سہارا کون بنے گا؟ کیونکہ دُنیا میں ان کا ان کی بیوی کے سوا کوئی نہ تھا۔ آخر کار بڑی منّتوں' مرادوں کے بعد شادی کے دسویں سال قدرت نے ان کی جھولی بھر ہی دی۔ نوید ان کے لئے واقعی خوشیوں کی نوید بن گیا۔ وجاہت صاحب ترقی کر کے منیجر بن گئے۔ پھر انہوں نے کچھ قرضہ وغیرہ لے کر کپڑے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری لگالی۔ اب وہ خاصے آسودہ حال ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنا مکان بھی خرید لیا تھا۔ ہوتے ہوتے ان کا کاروبار ایسا چلا کہ وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے تو ان کے لئے سونا بن جاتی۔ چند ہی سال میں وہ وجاہت حسین سے سیٹھ

وجاہت حسین بن گئے۔ "نوید ٹیکسٹائل مل" ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی اب ان کی اپنی شاندار کوٹھی تھی جہاں دنیا بھر کی آسائشیں میسّر تھیں اور ان کی خوشیوں اور امیدوں کا مرکز ان کا اکلوتا بیٹا نوید تھا جو کہ شہر کے مہنگے ترین اسکول میں پڑھ رہا تھا۔

نوید بڑا خوبصورت اور پیارا بچہ تھا۔ سُرخ و سفید رنگت پر سیاہ چمکدار شوخ آنکھیں بہت بھلی لگتی تھیں۔ جتنا وہ خوبصورت تھا اتنا ہی ذہین بھی تھا۔ ننھی سی عمر میں ہی ایسی باتیں کیا کرتا کہ سیٹھ وجاہت اور ان کی بیگم بھی دنگ رہ جاتے۔ اسکول میں اس کی پروگریس شاندار تھی۔ ابھی تک وہ ہر کلاس میں فرسٹ آتا رہا تھا۔ پانچویں کلاس میں جب اس نے صوبے میں ٹاپ کیا اور اخبارات نے اس کی تصویریں چھاپیں تو وجاہت صاحب اور ان کی بیگم کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ اس خوشی میں انہوں نے ایک شاندار قسم کی تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تقریب ان کی اپنی کوٹھی "قصرِ نوید" میں ہی ہونا تھی اور اس کے لئے بہت زبردست اہتمام کیا جارہا تھا۔ نوید کے لئے ان کے "چاؤ چونچلوں" میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اس کے لئے روزانہ نت نئے قسم کے کھلونے گھر میں آتے تھے۔ اور روزانہ ہی کہیں نہ کہیں سیر و تفریح کا پروگرام بنایا جاتا تھا۔

تقریب میں دو روز رہ گئے تھے۔ وجاہت صاحب نے سوچا کہ کچھ ضروری اور "فائنل" شاپنگ کرلی جائے۔ چنانچہ وہ بیگم کے ساتھ اپنی شاندار گاڑی میں شاپنگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ نوید بھی ان کے ساتھ ہولیا تھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

وجاہت صاحب سمجھے کہ شاید نوید کھلونا دیکھنے کے شوق میں دُکان میں داخل ہوچکا ہے۔ وہ بھی جلدی سے فٹ پاتھ پر چڑھے اور دُکان تک پہنچ گئے۔ ان کی بیگم ان کے ساتھ تھیں۔ وہ بھی پریشان تھیں۔ لیکن نوید دُکان میں بھی نہیں تھا۔

"وہ ..... یہاں ..... کوئی بچہ آیا تھا؟" اکیلا۔" وجاہت صاحب نے عجلت میں دکاندار سے پوچھا۔

"نہیں جناب' اکیلا بچہ تو یہاں کوئی نہیں آیا۔ البتہ کچھ دیر پہلے دو بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ آئے تھے۔"

وجاہت صاحب جلدی سے دکان سے باہر نکلے اور فٹ پاتھ پر نظریں دوڑائیں۔ شاپنگ کے لئے آنے والے بڑی تعداد میں فٹ پاتھ پر رواں تھے۔ لیکن نوید نظر نہیں آرہا تھا۔ وجاہت صاحب نے آس پاس کی دکانوں میں بھی جھانکا'

مہارت

تم کسی کام میں اپنے بڑوں اور اپنے چھوٹے سے تو جیت سکتے ہو لیکن اپنے برابر والے سے جیتنے کے لئے بڑی مہارت اور عقل مندی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مرسلہ... محمد عرفان صدیقی

لیکن نوید وہاں ہوتا تو ملتا۔ اسے یا تو آسمان نگل گیا تھا ..... یا پھر زمین کھا گئی تھی۔ اب تو وجاہت صاحب اور ان کی بیگم کی پریشانی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کرتے، ان کی نظر فٹ پاتھ کے نیچے پڑی، جہاں ان کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر کچھ لوگ جمع تھے، جن کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، وجاہت صاحب فوراً" وہاں پہنچے۔

"کیا ہوا بھائی، کیا ہوا؟؟" وجاہت صاحب نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"ارے بھائی، ہونا کیا تھا ہماری بلدیہ کی نااہلی بڑھتی ہی جارہی ہے۔" "پھر بھی کچھ تو بتائیے کہ ہوا کیا؟؟" وجاہت صاحب کے لہجے میں جھلاہٹ در آئی۔

"اجی کچھ دیر پہلے یہاں گٹر میں ایک بچہ گر گیا ہے۔ گٹر کا ڈھکنا کافی دنوں غائب تھا۔ اس آدمی نے ہجوم کے بیچ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "میں نے آخری وقت میں اسے دیکھا ہے نیلی پینٹ اور سرخ شرٹ پہنا تھا وہ۔"

"کیا۔!!!" وجاہت صاحب کو جیسے زور دار چکر آگئے۔

"ہاں ہاں، کچھ ایسے ہی تھا۔"

"نہیں۔!!" بیگم وجاہت کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ وہیں غش کھا کر گر پڑیں۔

وجاہت صاحب ہجوم کو چیرتے ہوئے گٹر تک پہنچے اور اس کے اندر جھانکا لیکن۔ وہاں تو اتھاہ گہرائی اور ہولناک تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ اخبارات میں اکثر اس قسم کے ہولناک واقعات پڑھتے رہتے تھے کہ کوئی بچہ انتظامیہ کی نا اہلی کی وجہ سے کھلے مین ہول میں گر کر ہلاک ہوگیا۔ اور آج ان کا اپنا اکلوتا بچہ ان کے مستقبل کا سہارا، کھلے ہوئے گٹر کا شکار ہوگیا تھا۔

کسی نے ایک رفاہی ادارے کے غوطہ خوروں کو فون کیا۔ پھر بارہ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ننھے بچے کو گہرے گٹر سے باہر نکالا گیا لیکن اس حالت میں کہ وجاہت صاحب اپنے دونوں ہاتھوں پر انتظامیہ کے ظلم کا شکار ہونے والے اپنے معصوم لخت جگر کی لاش گھر لے جارہے تھے!!

چُنّو منّو کی جادو کی بوتل

کسی جنگل میں ایک بڑھیا نانی ہپّو نامی رہتی تھی۔ اُس کے دو لڑکے تھے۔ ایک کا نام تھا چنّو اور دُوسرے کا منّو۔ نانی ہپّو کی ایک لڑکی بھی تھی جو شہر میں رہتی تھی۔ ایک مرتبہ گرمی کے موسم میں نانی ہپّو جب اپنی لڑکی کے پاس جانے لگیں تو جاتے وقت چنّو منّو کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ دیکھو گرمی میں گھر سے باہر نہ نکلنا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ آج کل سورج بہت غصّے میں رہتا ہے اور دھوپ میں پھرنے والوں کو سزا دیتا ہے۔ نانی کی

نصیحت کا چنّو منّو پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دوسرے ہی دن صبح گھر سے کھیلنے نکلے اور کھیلتے کھیلتے ندی کے کنارے جا پہنچے۔ وہاں ایک مسافر بیٹھا تھا۔ مُسافر کہیں دُور سے آیا تھا اور کہیں آگے اُسے جانا تھا۔ تھوڑی دیر ستانے اور پیاس بجھانے کے لیے ندی کے کنارے بیٹھ گیا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک ٹوکری میں بڑی خوبصورت سی بوتل رکھی ہوئی تھی جس میں لال رنگ کا کچھ شربت سا

تھا۔ چنّو منّو شکاری کے پاس پہنچے تو شکاری نے بڑے پیار سے اُن کے نام پوچھے اور بہت سی باتیں کیں۔ شکاری اُن کی باتوں سے کچھ ایسا خوش ہوا کہ چلتے وقت اُس نے وہ بوتل اُن ہی کو دے دی۔ چنّو منّو اُس بوتل کو پا کر خوش خوش اپنی جھونپڑی میں آئے اور بوتل کو ایک طرف رکھ دیا کہ نانی کو دکھائیں گے۔ پھر باہر آ کر دھوپ میں کھیلنے لگے۔ سُورج تو گرمی میں کسی کو نہیں بخشتا۔ ان لڑکوں کو دیکھ کر اُس نے

اپنا کام شروع کیا اور بڑی بڑی لال آنکھیں نکال کر گھورنے لگا۔ چنّو منّو پسینہ پسینہ ہو گئے اور گھبرا اٹھے ـــــ دیکھتے کیا ہیں کہ وہی مُسافر والی لال بوتل ہَوا میں اُڑتی ہوئی اُن کے پاس آ رہی ہے۔ یہ اور ڈرے، مگر بوتل بولی "بیٹا ڈرو نہیں۔ بَس تو تمھاری مدد کو آئی ہوں۔ لو یہ ایک گلاس شربت پی لو۔ پھر سُورج تمھارا کچھ نہیں بِگاڑ سکتا۔" یہ سنتے ہی

سُورج نے شرم کے مارے اپنے چہرے کو بادلوں میں چھپا لیا اور غائب ہو گیا۔ چنّو منّو کی رات تو خیریت سے گزر گئی، مگر جب صبح وہ باہر کھیلنے گئے تو اُن کو ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ لُو کا دیو تھا اور بڑی تیزی کے ساتھ اُن کی طرف دونوں ہاتھ پھیلائے اُڑتا چلا آ رہا تھا۔ اس کو بھی سُورج نے اپنا بدلہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔

یہ چُنو مُنو سے بولا، "مَیں تم کو زندہ ہی کھا جاؤں گا۔" اُن کی آن میں دہی لال بوتل اُڑتی ہوئی اُن کے پاس آگئی۔ بوتل کو دیکھتے ہی لُوکا دیو دُم دبا کر بھاگ گیا۔ سورج بہت غصّے میں تھا کہ چنو مُنو کا کچھ نہ بگاڑ سکا، اس لیے اِس مرتبہ اُس نے ایک چال اور چلی۔ فوراً ہی پیاس کے دیو کو حکم دیا کہ چنو مُنو کے گھر جا کر اُن کے مٹکے میں چُھپ جائے اور پانی

کے ذریعہ سے ان کے پیٹ میں گھُس جائے۔ دیو نے ایسا ہی کیا۔ شام کو جب چُنو مُنو نے مٹکے کا پانی پیا تو اُن کے پیٹ پُھول کر خود مٹکے جیسے ہو گئے اور پیاس بڑھتی ہی گئی۔ چنو مُنو نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی پیتے پیتے ان کا پیٹ ہی پھٹ جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ لال بوتل اُڑ کر اُن کے پاس آگئی اور کہنے لگی، "یہ لو، ایک گلاس شربت پی لو، اس کے پیتے

ہی اس پیاس کے دیو کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔" جب سورج صاحب نے دیکھا کہ لال بوتل کے سامنے اُس کی تمام چالیں بیکار ثابت ہوئیں تو اس نے بیماری کی دیوی کو بُلایا کہ شاید اُس کی کوئی چال چل جائے۔ بیماری نے سُورج کی تمام باتیں سُنیں اور یہ کہہ کر کہ میرا وار کبھی خالی نہیں جاتا، رخصت ہو گئی۔ رات کو جب چنو مُنو کھانا کھانے بیٹھے تو بیماری کی دیوی نے چپکے سے نظر بچا کر اُن کے

کھانے میں چٹنی سے کچھ ڈال دیا۔ کھانے کے بعد چُنّو منّو کو قے اور متلی ہونے لگی۔ وہ غریب گھبرا کر رونے لگے۔ بوتل نے اب کے پھر اُن کی مدد کی۔ اُن کے پاس آئی اور بولی "بیٹا، گھبرانا نہیں، جلدی سے ایک گلاس شربت پی لو۔ ابھی تمھاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" شربت کا گلاس پیتے ہی دونوں ہنسنے لگے۔ سورج نے منھ کی کھائی اور یہ فیصلہ کیا کہ جہاں یہ لال بوتل ہوگی

وہاں اس کی دال کبھی نہیں گلے گی۔ اُس دن سے چنّو منّو نے اس بوتل کا نام جادُو کی بوتل رکھ لیا۔ جب نانی چنّو شہر سے واپس آئیں تو چُنّو منّو نے سب باتیں نانی کو سُنائیں۔ وہ بولیں، "بیٹا ذرا ہم بھی تو تمھاری جادُو کی بوتل دیکھیں"۔ بوتل کو دیکھتے ہی وہ ہنس کر بولیں "بیٹا یہ تو ہمارے دوست حکیم محمد سعید کے ہمدرد پاکستان کے شربت رُوح افزا کی بوتل ہے جسے تم جادُو کی بوتل کہتے ہو۔ بوتل

سچ مچ جادو کا اثر رکھتی ہے۔ گرمی کی تمام تکلیفوں کے لیے اس سے اچھا پاکستان میں کیا دنیا میں کوئی اور شربت نہیں ہے۔" چنّو منّو بولے: "اماں جب آپ شہر جائیں تو ہمارے لیے ایک بوتل ضرور لیتی آئیں۔" چچو! تم بھی آج ہی اپنے ابا سے کہہ کر ایک بوتل شربت رُوح افزا کی ہمدرد سے یا اپنے شہر کے کسی اسٹاکسٹ سے خرید لو اور پھر اس کے جادو کا تماشہ دیکھو۔

راحتِ جاں رُوح افزا مشروبِ مشرق ہمدرد

اسٹاف روم

مستقبل کے مظلوموں کا ڈرامہ

فصیح باری خان

(مختصر دورانیے کا کھیل)

کردار اس ترتیب سے اسٹیج پر آتے ہیں :

۱- مسز نسیم ۲- مسز سلیم ۳- فرمان ۴- نصیر ۵- نسیم ۶- جمیل ۷- آٹھ سالہ بچہ ۸- سلامت

پردہ کھُلتا ہے!

(گندہ سا کمرہ- ایک پُرانی سی الماری کونے میں- درمیان میں میز جس پر اخبار، مونگ پھلی کے چھلکے اور ایک موزہ پڑا ہوا ہے- چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہیں) پسِ منظر سے بچّوں کی آوازیں : "ہاف ٹائم ہوگیا..... ہاف ٹائم ہوگیا-"

مسز نسیم : (اندر آکر کُرسی پر بیٹھ جاتی ہیں- اپنی جگہ سے اُٹھ کر موزے کو حیرت سے دیکھتی ہیں جو میز پر پڑا ہے- ہاتھ میں موجود چشمے کو آنکھوں پر لگاتی ہیں اور ایک بار پھر موزے کی جانب دیکھتی

ہیں۔)

مسز سلیم : (باہر سے اندر آتے ہوئے) "زیادہ غور مت کیجئے موزہ ہے ..... گندہ موزہ۔ یہاں تک بدبو آرہی ہے۔ یقیناً" فرمان صاحب کا ہوگا....."

مسز نسیم : (حیرت سے) "وہ کیوں۔"

مسز سلیم : "ان کو ہی عُنابی رنگ اتنا پسند ہے۔ بھلا بتایئے یہ عُمر ہے کوئی عُنابی رنگ پہننے کی مگر روز چلے آرہے ہیں عُنابی قمیض پہنے ہوئے۔"

فرمان، نصیر اور جمیل باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

فرمان : (دونوں خواتین کی موجودگی سے بے خبر زوردار آواز میں) "مسز سلیم کا وہ شہرۂ آفاق مکروہ رنگوں کا سوئیٹر کب مکمل ہوگا۔ ان کے شوہر تو روز بہ روز پھُولتے جارہے ہیں۔ کہاں آئے گا وہ ننھا مُنّا سوئیٹر انہیں....."

مسز سلیم : (غصّے سے) "وہ سوئیٹر میرے شوہر کا نہیں بلکہ میرے چھوٹے بیٹے کا ہے۔"

فرمان : (کھسیا کر) "سوری مسز سلیم میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔"

مسز سلیم : (طنز سے) "آپ کی حسِ مزاح آج کل کچھ زیادہ ہی نہیں بڑھ گئی ہے؟"

نصیر : (بات بنا کر) "چھوڑیئے بھی آپ لوگ بھی جانے کہاں کے قصّے لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بھئی آج جمعرات ہے سموسے نہیں منگوانے (دروازے تک جاکر بُلند آواز میں) "بھئی سلامت ایک درجن سموسے لے آنا۔"

جمیل : (اچانک چلّا کر) "یہ موزہ کس کا ہے؟"

نصیر : "کون سا موزہ!"

جمیل : (منہ بنا کر) "یہی جو کسی جاہل نے میز پر رکھا ہوا ہے۔"

مسز سلیم : "بُری بات ..... فرمان صاحب بُرا مان جائیں گے۔"

جمیل : "یہ موزہ آپ کا ہے؟" فرمان صاحب؟"

فرمان : (حیرت سے موزے کو دیکھتا ہے۔ پھر غور سے اپنے دونوں پاؤں اُٹھا کر دیکھتا ہے) "اوہ شاید میں پہننا بھول گیا۔ (میز سے اُٹھا کر موزہ پہنتے ہوئے) "بھائی! صاحب زادے کو صبح سوا چھ بجے اسٹاپ تک لے جانا ہوتا ہے۔ ان کی چمچماتی ہوئی بس گلیوں محلّوں میں نہیں آتی۔ اجی موصوف کے لئے صبح پانچ بجے اُٹھنا پڑتا ہے۔ آج پہلا پیریڈ فری مل گیا تو غنیمت جانا۔ جوتے موزے اُتار کر تھوڑی دیر صوفے پر کمر سیدھی کرلی۔ شاید نیند میں تھا اس لئے بے خیالی میں ایک موزہ پہننا بھول گیا۔"

"کیا کہنے ہیں اس بے خیالی کے۔ شکر ہے موزہ پہننا ہی بھولے ....." (تمام اساتذہ دھیرے دھیرے باتوں میں مصروف ہوجاتے ہیں) ایک بچہ

روتا ہوا اندر آتا ہے۔

اساتذہ بچے کی آمد سے بے خبر باتیں کر رہے ہیں۔

بچہ مزید بلند آواز میں روتا ہے۔

اساتذہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

بچہ تیسری بار چیخنے کے انداز میں روتا ہے۔

تمام افراد فوری طور پر اس کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

فرمان : (غصے سے) "نالائق کیا مصیبت آگئی ہے۔ کیوں چلا رہے ہو؟"

مسز سلیم : (غصے سے سرزنش کرتے ہوئے) "آہستہ ڈانٹئے فرمان صاحب۔ میری بہن کا بچہ ہے۔"

فرمان : "سوری مسز سلیم ..... (پیار سے پچکار کر) "بیٹا آپ کیوں رو رہے ہو؟"

بچہ فرمان صاحب کو کچھ نہیں بتاتا

مسز سلیم : (رندھی ہوئی آواز میں) "یاسر..... یاسر میری جان یہاں آؤ ..... کیوں رو رہے ہو بیٹا؟"

بچہ سسکیاں بھرتا ہوا مسز سلیم تک پہنچتا ہے ..... پھر زور سے قہقہہ مارتا ہے۔

بچہ : "آنٹی کیسا بیوقوف بنایا۔ میں تو ایکٹنگ کر رہا تھا۔ اب تو میں ایکٹنگ چیلنج میں آسکتا ہوں ناں؟"

مسز سلیم : (تیز لہجے میں) "شٹ اپ جاؤ دفع ہو جاؤ۔"

بچہ چلا جاتا ہے۔ تمام افراد دھیرے دھیرے ہنس رہے ہیں۔

مسز سلیم : "کون سا میری سگی بہن کا لڑکا ہے۔ دور کی خالہ زاد بہن کا لڑکا ہے۔"

فرمان : "جی ہاں یقیناً" ہوگا ..... (جمیل کی طرف متوجہ ہو کر) "ویسے یار یہ اسکول ہے بڑا عجیب....."

جمیل : "وہ کیوں.....؟"

فرمان : "اس اسکول میں زیادہ تعداد تو اسکول کے اسٹاف کے بچوں اور رشتے داروں کی ہے ہے۔ شکر ہے میں نے اپنے بیٹے کو اس اسکول میں ایڈمیشن نہیں دلوایا۔ (مسز سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے)

"کیونکہ مجھے اس اسکول کے اساتذہ کے تعلیمی معیار کے بارے میں مکمل طور پر آگاہی ہے۔"

مسز سلیم : (چمک کر) "اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

فرمان : (جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے) "جی مسز سلیم آپ نے مجھ سے کچھ کہا.....؟"

مسز سلیم : (دانت پیس کر) "اچھی طرح جانتی ہوں میں آپ کو..... (بڑبڑا کر) عجیب کہیں کے۔"

مسز نسیم : (نرمی سے) "چھوڑو بھی ..... بھئی

تمہیں معلوم تو ہے کہ فرمان صاحب کو مذاق کرنے کی عادت ہے۔"

مسز سلیم : "مجھے مذاق پسند ہے مسز نسیم مگر مذاق اور چھچھورپن میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ کیوں نصیر صاحب......؟"

نصیر : "جی ہاں بالکل......!"

مسز سلیم : "میں نے غلط تو نہیں کہا نا جمیل صاحب......؟"

فرمان : "آپ بھلا کبھی غلط کہہ سکتی ہیں۔"

مسز سلیم : "میں نے آپ سے تو نہیں پوچھا۔"

فرمان : "میں نے سوچا نصیر اور جمیل کے بعد میری ہی باری ہے اس لئے روانی میں بول گیا۔ معذرت چاہتا ہوں۔"

سلامت آکر چائے اور سموسے میز پر رکھتا ہے۔

سلامت : "آج لوگ بڑے کم آئے ہیں جی!"

فرمان : "ہیڈ ماسٹر صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ تیسرے پیریڈ میں ہی وہیں چلے گئے ...... تم جاکر ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں بیٹھو کوئی آئے تو اسے ڈیل کرلینا۔"

سلامت چلا جاتا ہے!

مسز سلیم : (جھٹ سے) "مسز دُرّانی کیوں نہ جاتیں وہ تو خاص چمچی ہیں ہیڈ ماسٹر کی ..... اور وہ احسان اللہ صاحب تعزیت کی آڑ میں جی کھول کر لگائی بُجھائی کررہے ہوں گے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی تو ساری دُنیا کے جھوٹوں کی باتوں پر ہی اعتبار آتا ہے......"

فرمان : "مسز سلیم آخر برادری والوں کا خیال ہیڈ ماسٹر صاحب نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ جانتی ہیں مسز سلیم احسان صاحب نے تو ایک دن پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ بڑی بی گزرنے والی ہیں۔ کل پانچویں پیریڈ میں ایک بڑا ہی دردناک مضمون لکھ رہے تھے آپ تو جانتی ہی ہیں کہ بڑے میاں غائب دماغ کتنے ہیں حسبِ معمول کاپی کلاس میں ہی بھول گئے۔ میں نے جو اُٹھا کر دیکھا..... تو ہیڈ ماسٹر صاحب کی والدہ ماجدہ کے مرحومہ ہونے کے بعد والی سچویشن کو بڑی ہی دلخراش سچویشن بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ اب دیکھئے گا کسی دن اسمبلی میں اپنا طویل ترین مضمون سُنا کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے جذبات سے کھیلیں گے۔"

مسز سلیم : (باتوں میں بھرپور دلچسپی لیتے ہوئے) "فرمان صاحب یہ مسز دُرّانی تو آپ کے پڑوس میں ہی رہتی ہیں۔ آج کل کیا رنگ ڈھنگ ہیں ان کے......؟"

فرمان : "مت پوچھئے مسز سلیم ..... یقین کیجئے پورے محلے میں ان کے بچے رُلتے پھرتے ہیں۔ شوہر غریب ویسے ہی پیدائشی یتیم لگتا ہے۔

اس پر ننھّی سی جان پر ملازمت سے آنے کے بعد گھر کا بوجھ۔ خود تو کسی سیاسی تنظیم کی ورکر.... بنی ہوئی ہیں اس لئے گھر میں تو سرے سے ہی ٹکتی نہیں ہیں..... ابھی کل ہی کی بات لیجئے۔ میں بیوی کے ساتھ ان کے گھر پہنچا تو حسبِ توقع موصوفہ تو موجود ہی نہیں تھیں اور ان کے میاں باورچی خانے میں کدوؤں کی سبزی بنا رہے تھے۔"

مسز سلیم : "تیسری مرتبہ فیل ہو رہا ہے ان کا بڑا بیٹا۔ ویسے تو مجھے منہ نہیں لگاتیں مگر کل بڑے بہناپے سے کہنے لگیں کہ میں ان کے بیٹے کو حساب میں پاس کردوں میں کیوں کروں پاس' میں نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے ساری دُنیا کے کوڑھ مغز بچّوں کو پاس کروانے کا۔"

فرمان : "بالکل دُرست کہا آپ نے..... میں آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہوں۔"

(سموسوں کی پلیٹ مسز سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے) "آپ لیجئے ناں مسز سلیم!"

مسز سلیم : (خوش مزاجی سے) "ارے فرمان صاحب پہلے آپ لیجئے۔"

فرمان : "لیڈیز فرسٹ۔"

(سلامت آتا ہے)

سلامت : "ہاف ٹائم بند ہوئے کافی ٹائم ہو گیا ہے جی۔ بچے کلاسوں میں شور کر رہے ہیں۔ کلاس فورتھ نے تو آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔"

کرنیں

پاپکنز : گفتگو ختم کرنے کا وہی وقت ہوتا ہے جب دوسرا شخص کے بغیر ہر بات کے جواب میں اپنا سر ہلا شروع کردے۔

مولانا حالیؒ : کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو محنت او عقل مندی سے کام کرو۔

خلیل جبران : دوستی کا نازک رشتہ کچے دھاگے ک طرح ہوتا ہے دھاگہ ٹوٹ جاتا ہے تو جڑ تو جاتا ہے گ ماس میں گرہ آجاتی ہے۔

مولوی عبدالحقؒ : کوشش کے بغیر کامیابی کی امی فضول ہے۔

مرسلہ ... شیخو سلام پوری

مسز سلیم : "سلامت تمہیں بھی چین نہیں ہے۔ کبھی فرصت سے اسٹاف روم میں نہیں بیٹ سکتے۔"

(ہاتھ پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتی ہیں) اور ا ٹائم ہی کیا رہ گیا ہے بارہ بجنے میں بیس منٹ ہیں جاؤ تم چائے بنا کر لاؤ۔"

فرمان : "ہاں جلدی سے فٹافٹ!!"

بچّوں کا شور مسلسل سُنائی دے رہا ہے لیکن تمام ٹیچ پھر گپ لگانے میں مصروف ہو جاتے ہیں سلامت کندھے اُچکا کر اسٹاف روم سے باہر نک جاتا ہے۔ (پردہ گرتا ہے)

اور پھول کھل اٹھا

محمد عثمان بن سلیم

شاید پہلی مرتبہ ایسی گرمی پڑ رہی تھی۔ ندیم روزانہ ہی اسکول سے پیدل گھر آیا کرتا تھا۔ لیکن آج تو ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر کا فاصلہ میلوں لمبا ہو گیا ہو۔ اسے فکر ہو رہی تھی کہ بہن اس کی وجہ سے پریشان ہو رہی ہو گی کہ آج اسے کافی دیر ہو گئی تھی۔"

ندیم کی عمر بارہ سال تھی۔ اس سے بڑا ایک بھائی اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ ماں کچھ عرصے قبل ایک بیماری میں مبتلا ہو کر چل بسی۔ باپ جو کہ گھر کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے ملک سے باہر گیا تھا۔ وہ کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ ماں بیچاری آخری سانسوں تک اس کی راہ دیکھتی رہی۔ ندیم کا بڑا بھائی شفیق ندیم سے ایک ہی سال بڑا تھا۔ بہت چھوٹی عمر میں اسے بہت بڑی ذمہ داری سنبھالنی پڑی تھی۔ باپ ہوتا تو شاید وہ بھی ندیم ہی کی طرح اسکول جاتا۔ شفیق چاہتا تھا

کہ چھوٹا بھائی کسی طرح پڑھ لکھ جائے۔ ندیم کو پڑھائی سے تو دلچسپی تھی لیکن جیسا اُستادوں کا رویّہ اس کے ساتھ تھا اس سے اکثر اس کی دل شکنی ہوتی۔ اور وہ اسکول جانے سے گھبرانے لگا۔ اسکول میں ذرا سی بات پر کبھی پٹائی لگ جاتی کبھی بھری کلاس میں اس کو مُرغا بننا پڑتا اور ان سب باتوں سے ندیم کو شدید بے عزّتی اور احساس کمتری کا احساس ہوتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُستاد اسے اس طرح بے عزّت نہ کریں۔ لیکن یہ تو اس کا خیال تھا۔

کل ہاف ٹائم میں قلم میں سیاہی بھرتے وقت اس کے کپڑوں پر سیاہی کا داغ لگ گیا تھا۔ ہاف ٹائم کے بعد اُردو کا پریڈ تھا اور نجم الدین صاحب اُردو پڑھاتے تھے وہ غصے کے بہت تیز تھے۔ کلاس کا ہر لڑکا ان سے بہت گھبراتا تھا۔ پریڈ کے دوران ان کی نگاہ ندیم کی یونیفارم پر پڑی۔ پہلے تو ان کے لبوں پر مُسکراہٹ بکھری۔ پھر ایک دم جیسے آنکھوں میں انگارے بھر گئے "ادھر آؤ ندیم!" ان کے لہجے میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ ندیم اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کے پاس آیا۔ نجم الدین صاحب نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر ان کی نگاہ اس دھبے پر ٹھہر گئی۔ آپ کو پتا ہے کہ مجھے گندے یونیفارم پہنے ہوئے بچے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ سر وہ سیاہی بھرتے وقت ..... "تو خیال سے کیوں نہیں بھرتے سیاہی....." انہوں نے ندیم کی بات کاٹ دی اور لکڑی اٹھا کر دھڑا دھڑ اس کی پٹائی لگادی۔

اُستادوں کے ہاتھوں اپنی پٹائی کے تصور میں کھویا ہوا ندیم گھر پہنچا تو بہن اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ "شفیق بھائی نہیں آئے؟" بہن کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے سوال کر ڈالا۔ "ابھی ان کے آنے کا وقت کب ہوا ہے؟" نجمہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ ..... ہاں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" ندیم نے دھیرے سے کہا۔ "بھوک لگی ہے۔ تو کھانا دے دوں؟" نجمہ بولی۔ "نہیں بھائی کے ساتھ کھالوں گا۔" وہ بولا۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔ کبھی گھر کے حالات کے بارے میں سوچنے لگتا کہ بھائی اکیلا محنت کر کے کمارہا ہے تو کبھی اسکول کی سوچیں ذہن کے پردے پر ناچنے لگتیں۔ اسکول میں اب اس کا دل گھبراتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ اسکول چھوڑ کر بھائی کے ساتھ کام پر جانے لگے۔ تو شاید بھائی کی پریشانی کچھ کم ہوجائے۔ لیکن بھائی سے بات کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک شفیق کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ نجمہ سے اس کا پوچھ رہا تھا۔ "ہاں آگیا ہے آج کھانا آپ کے ساتھ کھائے گا۔" نجمہ کی آواز سنائی دی۔

"بلاؤ اسے" بھائی نے کہا۔ نجمہ اسے بلانے آئی تو وہ منہ ہاتھ دھو کر بھائی کے ساتھ کھانے بیٹھ گیا۔

کھانے کے دوران اس نے کئی دفعہ کوشش کی کہ بھائی سے بات کرے لیکن حوصلہ نہیں ہوا۔ شفیق کھانا کھا کے دوبارہ کام پر چلا گیا۔ اور ندیم ہوم ورک کے لئے کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔

اگلے روز اس کی آنکھ صبح دیر سے کھلی۔ گھبراہٹ میں بس یونیفارم پہن کر بستہ اٹھایا اور بغیر ناشتہ کئے چل دیا۔ جب اسکول پہنچا تو کلاس شروع ہو چکی تھی۔ "اسے پتہ تھا کہ اگر اب وہ کلاس میں گیا تو اس کی خیر نہیں۔" اسکول کا چوکیدار اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ پلٹا اور تیزی کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل گیا۔ چوکیدار نے شاید اسے آواز بھی دی تھی۔ لیکن اس نے سُنی ان سُنی کر دی۔ "کافی دور جا کر وہ رُکا اور اپنی سانس پر قابو پانے لگا۔ خوف کے باعث اب تک دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک خیال یہ بھی دل میں تھا کہ کہیں چوکیدار اس کی شکایت نہ کر دے۔ کل بھائی کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اس نے سوچا پھر اُستاد صاحب اسے سزا نہیں دیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو گیا۔ یونہی بے مقصد گلیوں میں چکر لگانے لگا۔ گھر جا کے بھی کیا کرتا۔

اگلے روز صبح اٹھا تو شفیق اس سے پہلے کام پر جا چکا تھا۔ رات کو وہ شفیق سے بات نہیں کر سکا تھا۔ "ذہن پریشان ہونے لگا کہ اب کیا کرے گا؟" میں استاد صاحب کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا..... لیکن دل کے کسی گوشے میں ایک خوف سا تھا۔

اسکول میں حاضری کے وقت جب اس کا نام پکارا گیا تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بڑی مشکلوں سے اُٹھا اُستاد صاحب نے اسے بلایا۔

"کل کیوں نہیں آئے تھے؟" ندیم کی بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پوری کلاس میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ "میں کچھ پوچھ رہا ہوں ندیم؟" اُستاد صاحب کا لہجہ بے حد سخت ہو گیا۔ "وہ ..... وہ سر! کل میں دیر سے اُٹھا تھا۔" بس وہ اتنا ہی کہہ سکا پھر آگے کہنے کی اس کے اندر ہمت نہیں تھی "چلو مرغا بن جاؤ۔ لاڈ صاحب اسکول آتے ہیں اور گیٹ سے ہی بھاگ جاتے ہیں۔" اُستاد صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔ ندیم کو شدید بے عزتی کا احساس ہوا۔ اس کی کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ "تم نے سُنا نہیں مُرغا بن جاؤ۔"

"نہیں بنوں گا مُرغا نہیں بنوں گا میں۔" اس نے چیخ کر کہا۔ اُستاد صاحب نے اس کی پیٹھ

پر دھڑا دھڑ بیدیں برسانی شروع کردیں۔ "نہیں بنو گے مُرغا تم نہیں بنو گے۔ زبان چلاتے ہو اُستاد سے، احترام نہیں کرتے ہو اُستاد کا؟" اُستاد صاحب بولتے جارہے تھے اور مارتے جارہے تھے۔

"یہ کیا ہورہا ہے صغیر صاحب!! اتنی بے دردی سے تو کبھی آپ نے اپنے بچوں کو بھی نہیں مارا ہوگا۔" صغیر صاحب کا ہاتھ اس آواز کو سُن کر ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ ان کے سامنے ڈائریکٹر آف اسکولز ایجوکیشن کھڑے تھے۔

"وہ ...... وہ ...... سر...... پڑھتا نہیں ہے یہ، اسکول سے بھاگ جاتا ہے، تنگ کرتا ہے۔ زبان چلاتا ہے!!" وہ ہکلاتے ہوئے بولے۔ "لیکن آپ نے کبھی اس کی وجہ بھی سوچی ہے کہ کیوں یہ بچہ اسکول سے بھاگتا ہے اور کیوں نہیں پڑھتا ہے۔ کیوں زبان چلاتا ہے؟" ڈائریکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر ندیم کے کاندھے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو وہ سسکنے لگا۔ "نہیں روتے بیٹے! تم تو بہت بہادر ہو اور اُستاد تو باپ کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی مار کا بُرا نہیں منانا چاہیئے۔ اور اس سے زبان درازی نہیں کرنی چاہیئے۔" انہوں نے ندیم کو گلے سے لگایا تو ندیم ہچکیوں سے رو پڑا۔ "نہیں نہیں ...... بہادر لوگ نہیں روتے۔ وعدہ کرو آئندہ پڑھائی میں

، اناؤں کے رجسٹر میں "کل" کا لفظ کہیں نہیں ۔تا۔ البتہ ۔ب وقوفوں کی جنتریوں میں بکثرت ملتا ہے ۔تی مندی اس لفظ کو قبول نہیں کرسکتی اور نہ سوسائٹی اس کو منظور کرتی ہے یہ تو محض بچوں کا بہلاوا ہے کہ فلاں کھلونا تمہیں کل لے کر دیا جائے گا یہ ایسے لوگوں کے استعمال میں آنے والی چیز ہے جو صبح سے شام تک خیالی پلاؤ بناتے رہتے ہیں اور شام سے جو صبح تک خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ (سرسید احمد خان)

دل لگاؤ گے۔ اسکول سے نہیں بھاگو گے۔ اور بڑوں سے زبان نہیں چلاؤ گے۔" ڈائریکٹر صاحب نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو ندیم نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ پھر اس نے گردن اُٹھا کر دیکھا تو اسے یوں لگا۔ جیسے وہ تپتے صحرا سے نکل کر کسی ٹھنڈے ٹھنڈے نخلستان میں آگیا ہو۔ "سر میں محنت سے پڑھوں گا۔ پڑھائی میں دل لگاؤں گا۔ اور بڑوں سے زبان نہیں چلاؤں گا!!" اس نے ڈائریکٹر صاحب کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر کہا تو جگنو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ مظلومیت کے نہیں ایک عزم کے ایک پُرجوش ولولہ کے ساتھ ڈائریکٹر صاحب نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو انہیں یوں لگا جیسے وہاں مُرجھائے ہوئے پھول کِھل اُٹھے ہوں!!

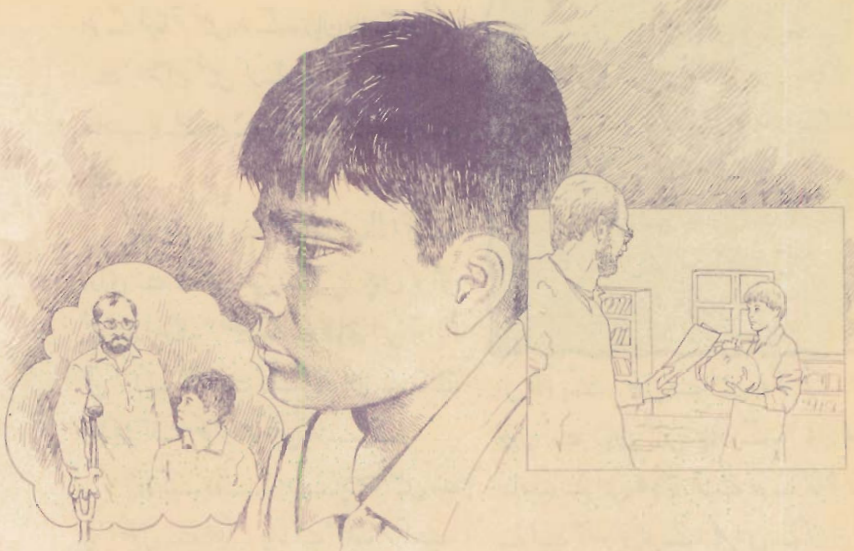

آپ کا فرمانبردار شاگرد

فرحات خان

تڑاخ ..... کی آواز کے ساتھ بید اس کی پیٹھ سے ٹکرائی اور اپنا نشان چھوڑ گئی۔ اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ کچھ نہ کرسکا۔

"آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ شاہد میاں' آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔" ماسٹر صاحب نے شاہد کو تنبیہہ دی۔ اور شاہد اپنی ڈیسک پر جا بیٹھا۔ اس کی پیٹھ درد سے چُور چُور ہو رہی تھی۔ پوری جماعت میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تمام بچے خاموش نظروں سے ماسٹر صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ماسٹر صاحب کچھ بولتے گھنٹہ لگنے کی آواز سنائی دی۔ ماسٹر صاحب بولے "اچھا تو تاریخ پاکستان کا سبق ہم کل پڑھیں گے" پھر وہ نعمان سے مخاطب ہوئے۔ "نعمان! میری بیساکھیاں لاؤ" نعمان نے قریب رکھیں بیساکھیاں ..... ماسٹر صاحب کی طرف بڑھادیں ماسٹر صاحب نے بیساکھیاں سنبھالی اور کلاس سے باہر

نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی جماعت میں شور شروع ہوگیا مگر شاہد ان سب سے الگ تھلگ کونے میں بیٹھا ہوا دیوار کو گھور رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو ان غلاموں کی طرح سمجھ رہا تھا۔ جنہیں سولہویں صدی میں انگریز' افریقہ سے پکڑ کر لے جاتے تھے اور پھر ساری زندگی کیلئے اپنا غلام بنالیتے۔ شاہد ان سب سے بے نیاز تھا۔ انہی میں بندروں جیسی ٹانگوں والا اکرم بھی تھا۔ وہ اُچھلتے ہوئے آیا اور شاہد کے قریب آبیٹھا۔ وہ ہکلا کر بولتا تھا۔

"یار ..... یہ ..... یہ تو نا ..... انصا..... فی ہے" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

شاہد کچھ نہ بولا وہ آج کچھ زیادہ ہی مجبور نظر آرہا تھا۔

"آخر ..... ما ..... ماسٹر صاحب ..... نے تمہیں سمجھ ..... سمجھ ..... کیا رکھا ہے؟" اکرم مزید بولا۔

"خادم ...میں ان کا ادنیٰ خادم ہوں" شاہد بول پڑا اس کے لہجے میں طنز اور غصہ تھا۔

"چلو ..... چھو ..... ڑو ..... یا ..... یار ..... یہ بتاؤ ..... تم ..... ہاری پڑھائی ..... کیسی ..... جا ..... رہی ہے؟"

اکرم نے موضوع بدلا۔ ابھی شاہد کچھ بول بھی نہیں پایا تھا کہ پیچھے کہیں سے چاک کا ٹکڑا' اکرم کے سر پر آکے لگا اکرم غصے سے کھڑا ہو کر چلایا۔ "یہ ..... کس ..... کسی کی حر..... حرکت ہے۔" کلاس میں بدستور اودھم مچا ہوا تھا اکرم بولا "یار شاہد ..... تم ..... تم ٹھہرنا ..... میں ..... اب ..... ابھی دیکھتا ..... ہوں ..... یہ کس کی ..... حر..... حرکت ہے؟" اکرم جیسے اُچھلتے ہوئے آیا تھا۔ ویسے ہی اُچھلتے ہوئے چل دیا اور شاہد وہیں بیٹھا رہا۔ بلاشبہ وہ ایک ہونہار طالب علم تھا اور چوتھی جماعت سے چھٹی جماعت تک اوّل آتا رہتا تھا مگر جب وہ ساتویں جماعت میں آیا تھا تو شجاع صاحب اس کے کلاس ٹیچر بنے تب اس کی زندگی ایک طرح سے عذاب بن گئی۔ پہلے تو شجاع صاحب نے اسے مانیٹر بنایا کہ وہ پچھلی جماعت میں اوّل آیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اس سے وہ اپنے کام بھی کرانے لگے جیسے کبھی سگریٹ منگوانا تو کبھی چائے منگوانا اسکول کی چھٹی ہوتی تو اسے ماسٹر صاحب کو رکشا کرا کر دینا پڑتا یہاں تک تو بات ٹھیک تھی مگر پھر انہوں نے شاہد کو اسکول کے بعد اپنے گھر بلا کر کام کاج کرانے شروع کردیئے چونکہ شاہد کا گھر ماسٹر صاحب کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کبھی کہتے جا شاہد آدھے درجن انڈے لے آنا۔ کبھی کہتے جا شاہد ایک کلو دودھ لے آ کبھی کوئی ضروری کاغذات دے کر کہتے کہ جاؤ میاں اسے فلاں

اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچادو۔ شاہد کو تو انہوں نے اپنا نوکر سمجھ لیا تھا اس نے بارہا چاہا کہ وہ منحرف ہوجائے مگر وہ ایسا نہیں کرپاتا۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا ماسٹر صاحب نے اسے چند ضروری کاغذات دے کر کہا تھا کہ وہ انہیں بتائے ہوئے پتے پر پہنچادے مگر چونکہ شاہد کی چھوٹی بہن کی طبیعت خراب تھی اور وہ اس کے لئے دوا لینے چلا گیا تھا۔ بعد میں وہ یہ کام بھول گیا اور آج ساری جماعت کے سامنے اسے بید پڑے تھے۔ پوری جماعت کو پتا تھا کہ شاہد بے قصور ہے مگر وہ صرف شاہد سے ہمدردی ہی کرسکتے تھے۔ شجاع صاحب کو مُفت میں ایک ملازم مل گیا تھا۔ جو بغیر چوں و چرا کے ان کے کام کردیتا تھا اب انہیں نوکر رکھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

شاہد اپنی ڈیسک پر بیٹھا چھت کے کونے میں بنے چڑیا کے گھونسلے کو دیکھ رہا تھا اسے آج چڑیا اور اس کا یہ گھونسلہ بہت بُرا لگ رہا تھا۔ شاید اسے چڑیا کی آزادی اور بے فکری دیکھ کر اس سے حسد محسوس ہونے لگا۔ تھا۔ وہ اپنا غصّہ کسی پر اُتار بھی نہیں سکتا تھا۔ شجاع صاحب ہی کی وجہ سے اس کے تین اہم ٹیسٹ بھی مس ہوچکے تھے۔ کیونکہ گھر سے تو وہ پوری طرح تیاری کرکے آتا کہ ٹیسٹ دے گا مگر عین وقت پر شجاع صاحب اسے کوئی کام دے دیتے شاہد نے جب ایک مرتبہ انکار کردیا تو شجاع صاحب نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے اس سال سالانہ امتحان میں فیل کروادیں گے۔ یہ سُن کر تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور اس نے اپنے آپ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اچانک کلاس میں چپڑاسی داخل ہوا اس کی جسامت اور قد قامت بہت بڑا تھا اور اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھی ہوئی تھیں اسی وجہ سے اسکول کے بیشتر بچے اسے چراغ کا جن کہتے تھے مگر چپڑاسی اس نام سے متفق نہیں تھا اسے داخل ہوتا دیکھ کر بچے سمجھے کہ استاد آگئے لہٰذا جماعت میں خاموشی سی چھاگئی مگر پھر چراغ کے جن کو سامنے پاکر بچے پھر اپنی اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے۔ اس نے کہا "چلو شاہد تمہیں نائب ماسٹر صاحب بلا رہے ہیں" اِشارہ شجاع صاحب کی طرف تھا جو نائب ہیڈ ماسٹر بھی تھے۔ شاہد تھکے تھکے قدموں سے شجاع صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

"سر کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" شاہد نے ادب سے پوچھا۔

"ہاں آؤ شاہد" شجاع صاحب نے اپنے موٹے عینک کے موٹے عدسوں کو ملائم کپڑے سے پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ آرام دہ کرسی میں دھنسے

میز کے پیچھے سے شاہد کو دیکھ رہے تھے قریب ہی ان کی بیساکھیاں رکھیں تھیں کبھی کبھی شاہد کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان ہی بیساکیوں سے ماسٹر صاحب کا سر پھوڑ دے مگر خود ہی اسے شرمندگی ہوتی کہ یہ خیال اس کے ذہن میں کیسے آیا۔

شاہد یہ لسٹ لو اور یہ پیسے" ماسٹر صاحب نے اسے کاغذ کا ٹکڑا اور روپے پکڑاتے ہوئے کہا "یہ سبزیاں وغیرہ ہیں انہیں فوراً میرے گھر پہنچا دو۔" وہ مزید بولے تو ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

شاہد نے سرسری سی نگاہ لسٹ پر ڈالی تو اسے احساس ہو گیا کہ سامان اچھا خاصا ہے۔

"اور سنو! اب کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے" ماسٹر صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔

"جی جناب" شاہد نے ادب سے کہا۔

"اب جاؤ" ماسٹر صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ ان کی اس اچانک تبدیلی پر شاہد کو حیرت ہوئی مگر یہ کچھ ہی دیر قائم رہی کیونکہ جیسے ہی وہ جانے کے لئے پلٹا تو پیچھے سے آواز آئی "رکو"

"جی جناب!"

"تمہارا کوئی بھائی بھی تھا کیا نام ہے اس کا؟" ماسٹر صاحب نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"زاہد۔ زاہد شکور۔" شاہد نے جواب دیا۔

"ہاں زاہد شکور اسے میرے گھر آج شام بھیج دینا۔"

"کیوں سر؟" شاہد نے پوچھا مگر اپنے لہجے کو بدستور باادب رکھا۔

"بیگم نے کافی دنوں سے کہہ رکھا ہے سوچتا ہوں شام ہی اس سے پانی کی ٹنکی مرمت کرالوں کافی دونوں سے لیک کر رہی ہے اور ویسے بھی گرمیاں آرہی ہیں تمہیں تو پتا ہی ہے پانی کی کتنی ضرورت پڑے گی خاص کر مُنّا تو پانی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔" ماسٹر صاحب اپنی دُھن میں کہے جارہے تھے اور شاہد کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

گویا اب اس کا بھائی بھی۔ یعنی اس کا بھائی بھی ماسٹر صاحب کی غُلامی کرے گا ان کے کام کرے گا وہ بھی اپنی مرضی کے بغیر اپنی پڑھائی کی قربانی دے گا اب کیا ہو سکتا تھا۔ شاہد تھکے قدموں سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کا رُخ اسکول سے باہر بس اسٹاپ کی طرف تھا۔ جہاں سے اسے سبزی منڈی جانا تھا۔ ماسٹر صاحب کے لئے وہاں سے سبزیاں خرید کر ان کے گھر پر یہ سامان پہنچانا تھا اور پھر اسے اپنے گھر لوٹنا تھا کیونکہ اس وقت تک اسکول کی چھٹی ہو چکی ہوگی۔

شاہد اپنے بھائی زاہد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس سے دو سال چھوٹا تھا اور اس کے

اسکول میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ انکار کی صورت میں شجاع صاحب زاہد کو بھی فیل کر سکتے ہیں۔ اس نے سوچا شاہد بس اسٹاپ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے بھائی کو ماسٹر صاحب کے ہاتھوں سے کس طرح بچائے۔

بس آگئی اور دوسرے مسافروں کی طرح شاہد بھی جدوجہد کے بعد بس میں جا بیٹھا۔ بس چل پڑی شاہد نے بس کی کھڑکی کھول دی سیاہ اور آلودہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے پر سے ٹکرایا اور اس کی آنکھیں چمک اُٹھی۔ وہ نجات کا راستہ ڈھونڈ چکا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنے بھائی کو بلکہ خود کو بھی ماسٹر صاحب کے چُنگل سے آزاد کرالے گا' کیونکہ اب وہ تھک چکا تھا یہ کام کرتے کرتے وہ اسکول پڑھنے جاتا تھا نوکری کرنے نہیں۔

شاہد نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے والد سے بات کرے گا۔

"ہاں میں اپنے پاپا سے بات کروں گا۔ ہاں ایک ایک بات انہیں بتاؤں گا ساری باتیں چائے منگوانا' پان منگوانا' سگریٹ منگوانا سب کچھ ایک ایک بید کا بدلہ لوں گا۔ وہ اپنے آپ سے کہے جارہا تھا۔ اسی دوران کنڈیکٹر نے سبزی منڈی کی آواز لگائی مگر شاہد کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ اسے تو آزادی کا راستہ مل گیا تھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

کھانے کی میز پر شاہد' اس کے والد' والدہ اور تمام اہلِ خانہ موجود تھے۔ "ہاں بھئی شاہد تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہے؟ پاپا نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے شاہد سے پوچھا اور یہی موقع تھا کہ جسکا شاہد کو انتظار تھا۔

"مجھے تو پڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا" شاہد غمزدہ لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب برخوردار" شاہد کے پاپا تشویش سے بولے۔

یہ بات سُن کر سب اہلِ خانہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہمارے کلاس ٹیچر ہیں وہ مجھے اپنا نوکر سمجھتے ہیں کبھی کہتے ہیں گھر کی سبزی لے آؤ' کبھی کہتے ہیں ....." اور اس نے وہ تمام باتیں بتادیں جو اس کے ساتھ ہو رہی تھیں اور آخر میں یہ بھی کہ اب انہوں نے اس کے بھائی زاہد سے بھی کام کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سب گھر والے انتہائی حیران تھے شاہد بے دھڑک بولے جارہا تھا اسے اپنی منزل قریب دکھائی دے رہی تھی آزادی کی منزل۔

"کیا تم صحیح کہہ رہے ہو؟" اس کے والد نے شکی لہجے میں پوچھا وہی نہیں بلکہ کسی کو بھی کو

بھی یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ اُستاد کا یہ رُخ بھی ہو سکتا ہے۔

"پاپا کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟" شاہد نے کہا۔

"نہیں بیٹے یہ بات نہیں ہے اگر یہ سچ ہے تو میں کل ہی تمہارے اسکول آؤں گا اور تمہارے کلاس ٹیچر سے بات ہوگی۔"

☆ --- ☆ --- ☆

آج شاہد خوشی خوشی اسکول پہنچا اس کے دوستوں نے کافی دنوں بعد اس کے چہرے پر خوشی کی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ قومی ترانے کے فوراً بعد اس کے والد کلاس میں آگئے اس وقت تک شجاع صاحب جماعت میں نہیں آئے تھے۔

"بیٹا شاہد کہاں ہیں تمہارے اُستاد؟" انہوں نے پوچھا۔

"ابھی تو کلاس میں نہیں آئے ویسے اس وقت وہ اپنے کمرے میں ہوں گے۔" شاہد نے انہیں بتایا۔

"ٹھیک ہے پھر ان سے وہی ملاقات کرتا ہوں تم یہیں بیٹھو۔" پاپا نے کہا اور شاہد اپنی ڈیسک پر آبیٹھا۔

"یا ..... یار ..... شاہد تمہارے وا ..... والد صاحب ..... کس، کس سلسلے میں آئے ہیں؟" اکرم نے پوچھا۔

"ماسٹر صاحب کے سلسلے میں" شاہد نے کہا۔

"اوہ ..... تو ..... اس کا ..... م ..... مطلب تم ..... نے ما ..... ماسٹر صاحب کی شکایت کردی۔" اکرم نے اندازہ لگایا۔

"ہاں - کیوں میں نے غلط کیا؟" شاہد نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں ..... بال ..... بالکل صحیح ..... کیا۔ میں ..... میں بھی ..... تمہیں یہی ..... یہی مشورہ دینے والا تھا" اکرم نے جواب دیا۔

دونوں دوست کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کلاس کے بچے شرارتوں میں مصروف تھے کیونکہ پہلا پریڈ کلاس ٹیچر صاحب کا ہوتا تھا اور ان سے تو اس وقت شاہد کے والد بات کررہے تھے۔

شاہد بظاہر تو اپنے دوستوں سے باتیں کررہا تھا مگر اس کا دل کہیں اور تھا وہ سوچ رہا تھا کہ نا جانے کیا ہو؟" آخر کار تھوڑی دیر بعد چراغ کا جن شاہد کو بلانے آگیا۔

"شاہد تمہیں ماسٹر صاحب نے بلایا ہے۔" شاہد اُٹھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ چپڑاسی کے پیچھے ہولیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

شاہد ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ اندر ماسٹر صاحب اور اس کے والد صاحب موجود تھے۔

شاہد نے دیکھا کہ میز پر چائے اور بسکٹ رکھے ہیں۔

"آؤ آؤ شاہد" ماسٹر صاحب نرمی سے بولے وہ اپنی کرسی پر دھنسے تھے۔

"شاہد مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی" شاہد کے والد نے سختی سے کہا۔

شاہد حیراں نظر آنے لگا ابھی وہ کچھ بول ہی نہیں پایا تھا کہ ماسٹر صاحب بولے "کوئی بات نہیں شکور صاحب بچے تو نادانی کرتے ہیں ویسے شاہد تو میرا فرمانبردار شاگرد ہے۔"

شاہد کے والد بدستور غصّے میں تھے۔ وہ شاہد کی طرف کچھ کاپیاں بڑھاتے ہوئے بولے "یہ ہے تمہاری پڑھائی؟" شاہد نے دیکھا یہ ٹیسٹ کی کاپیاں تھیں جن پر اس کا نام لکھا تھا۔ یہ وہی ٹیسٹ تھے جو شاہد نہیں دے پایا تھا کیونکہ ماسٹر صاحب نے اسے اپنے کاموں سے ٹیسٹ کے وقت بھیج دیا تھا چنانچہ کاپیاں خالی تھیں۔

"یہ کاپیاں خالی ہیں شاہد تم نے یہ ٹیسٹ کیوں نہیں دیئے؟" شاہد کے والد نے سختی سے پوچھا۔

"جی وہ میں....." شاہد کچھ بولنے ہی والا تھا کہ ماسٹر صاحب بول پڑے "شاہد تم کئی دنوں سے اسکول بھی نہیں آرہے؟" لہجہ سوالیہ تھا۔

"جی یہ جھوٹ ہے میں تو....." شاہد کی زبان گنگ ہوگئی اس کے والد گرج پڑے "خبردار جو ماسٹر صاحب کو کچھ کہا۔ کتنے شرم کی بات ہے تم اپنے اُستاد کی بے ادبی کرنے لگے تم کئی دنوں سے اسکول سے غائب ہو ٹیسٹ میں نکمّے ثابت ہوئے اور ماسٹر صاحب کا کلاس میں مذاق اُڑاتے ہو اور جب ماسٹر صاحب نے مجھے بلانے کا فیصلہ کیا تو تم نے ان کے خلاف مجھے بھڑکایا" شاہد کے والد بولتے چلے گئے اور شاہد پتھر کا مجسّمہ بنا سب کچھ سنتا رہا۔ پھر وہ اُٹھے اور بات ختم کرتے ہوئے بولے "شاہد! چھٹی ہوجائے تو سیدھے اسکول سے گھر آنا تم سے گھر میں بات ہوگی" یہ کہہ کر شاہد کے والد نے ماسٹر صاحب سے اجازت چاہی۔ ماسٹر صاحب نے شکور صاحب کو گرمجوشی سے رخصت کیا اب کمرے میں شاہد اور ماسٹر صاحب تھے شاہد اب بھی اپنی جگہ مجسمہ بنا کھڑا تھا۔

ماسٹر صاحب نے گھنٹی بجائی چراغ کا جن کمرے میں داخل ہوا ماسٹر صاحب بولے "فضل دین۔ میری بید لانا۔"

فضل دین بید لے آیا۔ شاہد نے اپنی پیٹھ ماسٹر صاحب کے آگے کردی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک فرمانبردار شاگرد ہے۔

لذّت، فرحت، چاہت بھی، رنگت، ٹھنڈک، خوشبو بھی

نورس

قومی مشروب

احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ڈی-112، نورس روڈ، سائٹ کراچی-75700 فون: 2563520 (5 لائنیں) فیکس: 92- 21-2564570

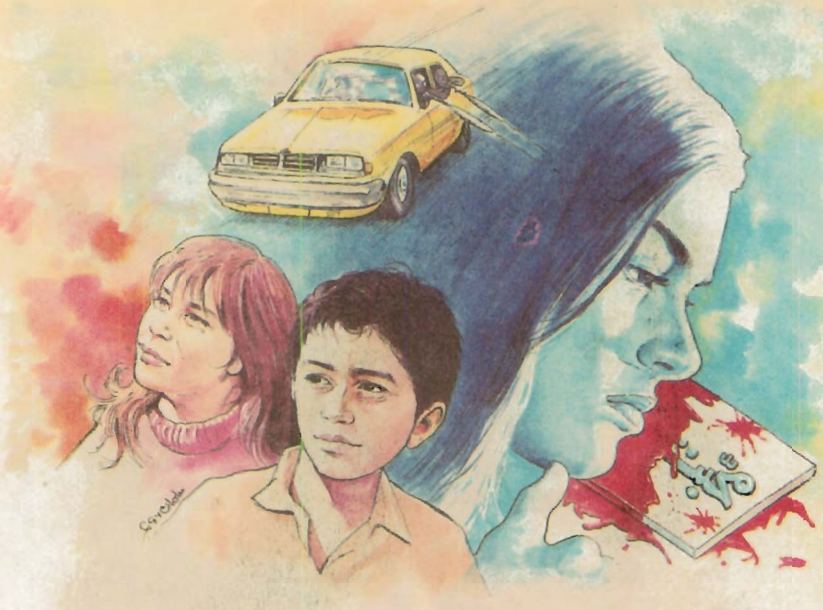

جواب کون دے گا

فرحین

مجھے دوسرے لوگوں کی طرح دن کو سونے کی عادت نہیں یہی وجہ تھی کہ کالج سے آنے کے بعد میں اپنا سارا کام دن کے وقت ہی ختم کرلیتی اور شام کا وقت گھر کے قریب ایک پارک میں گزارتی جہاں ذہنی سکون کے لئے تمام قدرتی مناظر موجود تھے۔ میرا گھر بہت بڑا ہے۔ مگر اس میں رہنے والے لوگ بہت کم۔ بس میں اور پاپا' اس کے علاوہ مالی خانساماں' چوکیدار وغیرہ جو ہر امیر گھروں کی ضروریات میں شامل ہوتے ہیں۔

میرے پاپا بڑے اچھے انسان ہیں اگرچہ شام کے بے حد تھکے ہارے آتے ہیں مگر اس کے بعد سارا وقت مجھے دیتے ہیں ہم دونوں رات کا کھانا اکثر باہر ہی کھاتے ہیں خوب گھومتے ہیں' کلب جاتے ہیں اور خوب گپ شپ کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پاپا نے مجھے ممی کی غیر موجودگی کا کبھی

احساس ہی نہیں ہونے دیا وہ میری ممی میری بہن میرے بھائی اور میرے دوست بھی ہیں ہاں تو میں بات کررہی تھی کہ گھر کے سامنے والے پارک کی جس میں تمام رنگوں کے پھول کھلتے ہیں، سُرخ، سفید، نیلے، پیلے، گلابی تمام رنگوں کے خوبصورت نرم ملائم پھول پارک میں لمبے لمبے درخت ہیں جن کی چھاؤں میں ماں جیسی محبت کا احساس ہوتا ہے۔ پھر دور دور تک سبزے کی قالین بچھی ہے اور سب سے بڑھ کر ملی جُلی آوازوں کا خوبصورت شور جن میں بچّوں کا شور، پرندوں کا شور، ہواؤں کا شور اور دور دور تک بکھرے زرد پتوں کا شور شامل ہوتا ہے، یہ سب مجھے بے حد اچھا لگتا ہے۔ اتنا سکون ہے یہاں!"میں نے اپنے کھُلے بالوں کو ربن سے باندھتے ہوئے سوچا۔ آج میں حسبِ معمول اپنے برش اور رنگ وغیرہ لے کر نہیں آئی تھی اس لئے اس وقت میں بالکل فارغ تھی۔ میں چلتی ہوئی پارک کے سب سے لمبے درخت کے نیچے آگئی اور اس کی محبّت بھری چھاؤں میں بیٹھ کر کھیلتے ہوئے معصوم بچوں کو دیکھنے لگی۔ ہواؤں کے شریر جھونکوں سے ان معصوم بچوں کے رنگ برنگے تتلیوں جیسے کپڑے ہواؤں میں اُڑ رہے تھے لیکن وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز شور مچانے، اُچھلنے کودنے اور مُسکرانے میں مصروف تھے۔ میں ابھی اس دھنک، خواب اور بہار جیسے منظر کو دیکھنے میں محو تھی کہ بچوں کے شور نے مجھے ایک دم سے چونکا دیا۔

""آگیا! غبّارے والا آگیا، غبّارے والا آگیا..!!!""

اور پھر ایک پل ہی میں میرے سامنے بچوں کا ایک ہجوم اور غبارے والے کی ڈنڈی جس میں رنگ برنگے غبارے سجے تھے آگئے۔ میں نے مُسکراتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھا اور اپنا چھوٹا سا گلابی پرس نکال کر چند روپے نکالے اور غبارے والے کی طرف بڑھادیتے۔ غبارے والا میرے اس فعل سے بخوبی واقف تھا اس نے بھی مُسکراتے ہوئے روپے پکڑلیے اور بچوں کو ایک ایک کرکے غبارے دینے لگا۔ بچے اس قدر خوش تھے کہ خوشیاں ان کے ننھے منے چہروں پر کرنوں کی مانند بکھر رہی تھیں میں ابھی ان خوشیوں کو اپنے اندر جذب کر رہی تھی کہ میری نظر حسن اور ثانیہ پر پڑی یہ دونوں قدرے دور خاموشی سے بیٹھے کچھ کرنے میں مصروف تھے۔

حسن اور ثانیہ دونوں بہن بھائی تھے بے حد پیارے پیارے کلیوں کی طرح نرم و نازک پھُولوں کی طرح سرخ وسفید اور بہار کے موسم کی طرح خوشبودار۔ ان کے ابّو کا ابھی حالیہ ہنگاموں میں انتقال ہوگیا تھا۔ یہ دونوں ابھی بہت چھوٹے تھے حسن گیارہ سال کا اور ثانیہ سات سال کی مگر دونوں اپنے ابو کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے

تھے چونکہ ان کا گھر ہمارے محلّے میں ہی تھا اس لئے میں اکثر ان کے گھر چلی جاتی یا پھر انہیں اپنے گھر لے آتی۔ مجھے ان کے معصوم چہروں میں دکھ کی سختی اچھی نہیں لگتی تھی میرا جی چاہتا تھا کہ یہ بھی دوسرے بچّوں کی طرح ہنستے مُسکراتے رہیں۔

"کیوں ثانیہ آج غبّارے نہیں لوگی؟" میں نے حسن اور ثانیہ کے درمیان بیٹھے ہوئے کہا۔

"نہیں آپا آج ہم دونوں بہت ضروری کام کر رہے ہیں۔" ثانیہ نے میری گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"بتائیں گے ضرور بتائیں گے مگر کام ختم کرنے کے بعد۔" حسن نے سفید بورڈ اور مارکر کو چھُپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے میں ابھی نہیں پوچھتی ہاں ثانیہ اب تو تمہیں اسکول جانے سے ڈر تو نہیں لگتا ناں؟"

میں نے ثانیہ کو اپنی گود میں جھولاتے ہوئے کہا۔

"نہیں آپا اب تو مجھے اسکول سے بالکل ڈر نہیں لگتا بس صرف ایک چیز سے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا صرف ایک چیز سے؟" میں نے ثانیہ کے ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تو ثانیہ نے اثبات میں اپنا منا سا سر ہلا دیا۔

"ہاں میں سمجھ گئی تمہیں اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ ہے ناں؟" میں نے ثانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں آپا اندھیرے سے نہیں کیونکہ امی کہتی ہیں بہت سارے اندھیرے کو ایک مُنّی سی روشنی مٹا دیتی ہے۔" ثانیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر تمہیں جن، بھُوتوں سے ڈر لگتا ہے؟ نہیں نہیں وہ تو اللہ کا کلام پڑھنے سے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔" ثانیہ کی نظریں مسلسل میری طرف تھیں۔

"اچھا! پھر تمہیں!" میں نے سوچتے ہوئے کہا "ہاں پھر تمہیں ایٹم بم سے ڈر لگتا ہوگا۔"

"نہیں نہیں!!" اس سے بھی نہیں ثانیہ نے اُداس ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو تم ہی بتاؤ تمہیں بھلا کس سے ڈر لگتا ہے؟" میں نے ثانیہ کے بالوں میں بڑے پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"پتہ ہے آپا مجھے کس سے ڈر لگتا ہے؟" ثانیہ نے سوالیہ نگاہوں سے چند لمحوں کے لئے میری طرف دیکھا جو پھر کہا۔

"انسانوں سے.....!!"

"انسان سے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں آپا! اس لئے کہ انسان نے ہی میرے ابّو کو مارا ہے ابّو کو نہ اندھیرے نے مارا نہ چڑیل

نے نہ کسی جن سے نہ ایٹم بم نے۔" ثانیہ نے روتے ہوئے اپنا ننھا سا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میں ایک اندھیرے کنویں میں گرتی ہی چلی جا رہی ہوں۔ میرے پاس اس معصوم کے لئے کوئی تسلّی نہ تھی اس نے سچ جو کہا تھا۔ ابھی میری سوچوں کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا کہ حسن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"دیکھیں آپا میں نے اس بورڈ پر کیا لکھا ہے؟" میں نے آنسو بھری آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے دیکھا تو میرے درد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ حسن نے سفید بورڈ پر کالے مارکر سے بڑے حروفوں میں "محبّت" لکھا تھا۔

"یہ تم نے کیوں لکھا ہے حسن؟" میں نے حسن کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"آپا آپ اخبار پڑھتی ہیں؟" حسن نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں بیٹے! پڑھتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپا آپ نے دیکھا نہیں سارے اخبار میں بس یہی خبریں ہوتی ہیں یہاں اتنے لوگ مر گئے وہاں اتنے لوگ مر گئے اور انہیں مارتا کون ہے؟ یہ خود ہی ایک دوسرے کو مارتے ہیں .... جب میں نانی اماں کو خبریں سناتا ہوں تو بس یہی خبریں ہوتی ہیں۔ پتہ ہے نانی اماں کہتی ہیں آج کل انسانوں کے اندر نفرت کی سیاہ چادر تن گئی ہے۔ بہت سیاہ بالکل اندھیرے کی طرح اور اس اندھیرے میں انہیں صرف اپنا وجود نظر آتا ہے دوسروں کا نہیں مگر دادی اماں کہتی ہیں اس اندھیرے کو محبّت کی روشنی سے دور کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس بورڈ پر محبّت کا لفظ لکھا ہے تاکہ میں لوگوں کے دلوں میں محبّت کی روشنی پھیلا سکوں۔" حسن نے اپنی باتیں ختم کر کے میری طرف نم آنکھوں سے دیکھا پھر میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آپا! میں محبّت کی روشنی سے نفرت کے اندھیروں کو ختم کر سکتا ہوں ناں؟"

میں حیران تھی کہ اتنا چھوٹا بچہ اتنی بڑی بات کیسے کہہ رہا ہے جو بڑے جانتے ہوئے بھی نہیں کہتے۔ "جواب دیجئے ناں آپا!" حسن پوچھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ پارک میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ بچے بڑے چیختے چلاتے جدھر منہ اُٹھا گرتے پڑتے بھاگ نکلے۔

پارک کے مین گیٹ کے پاس ایک ییلو کیب کھڑی تھی اور تین چار ڈھاٹا بردار گیٹ کی جالیوں سے کلاشنکوف ٹکائے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔

"آپا......!!"

"ثانیہ! میرا ہاتھ پکڑو۔"

☆ "اگر تم نے اپنے دوست کو اس کے ہر رنگ میں نہیں پہچانا تو یاد رکھو کہ تم نہ اس کو اب سمجھے ہو اور نہ آئندہ کبھی سمجھو گے۔"

☆ "تمہیں چاہئے کہ حقیقت کو سمجھو تو ہمیشہ لیکن ظاہر کرو کبھی کبھی۔"

☆ "جب تم زندگی کے اسرار حل کر چکو گے تو موت کا شوق پیدا ہوگا۔ کیوں کہ موت بھی زندگی کے رازوں میں ایک راز ہے۔"

مرسلہ... محمد ریاض، حیدر آباد

پہلے ثانیہ کی پھر احسن کی آواز آئی۔

"احسن..... ثانیہ زمین پر لیٹ جاؤ گولیاں ادھر ہی آرہی ہیں۔" میں نے چیخ کر احسن اور ثانیہ سے کہا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ میری چیخ ثانیہ اور احسن کی چیخوں میں دب گئی۔ میں پارک کی گھاس پر اوندھی پڑی دونوں بچوں کو پکار رہی تھی اور اب ان کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ہر آواز کو دبا دیا تھا۔

میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ میں کچھ دیر تک گھاس پر گری پڑی رہی پھر کسی نے مجھے اُٹھا کر کھڑا کیا۔ دہشت گرد کار میں بیٹھ کر فرار ہو چکے تھے۔ طوفان گزر چکا تھا۔ پارک میں کلیاں مسلی پڑی تھیں، پھول مُرجھا گئے تھے۔ جگہ جگہ چپلیں اور جوتے بکھرے تھے۔

میرے ثانیہ اور احسن خون میں لت پت مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گھاس پر اوندھے پڑے تھے۔ اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

"حوصلہ کرو بیٹی! اللہ کو یہی منظور تھا تمہارے دونوں بہن بھائی دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔" کسی کی تسلی دیتی آواز مجھے سُنائی دی۔ "نہیں..... نہیں.....!!"

میں گھسٹتی ہوئی ثانیہ اور احسن کے قریب پہنچی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ میں گر پڑی۔ وہ سفید رنگ کا بورڈ تھا۔ جو اب احسن کے خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ لفظ محبت جو احسن نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، اب اسی کے لہو سے رنگین ہو رہا تھا۔ میں نے ثانیہ کے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کی دھڑکنیں خاموش تھیں تب میں گھسٹ گھسٹ کر احسن تک پہنچی اور ڈرتے ڈرتے اس کی نبض ٹٹولی وہ بھی مر چکا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں جیسے پوچھ رہی ہوں : "آپا! محبت کی روشنی سے کیا نفرت کے اندھیروں کو ختم کیا جا سکتا ہے؟"

میں رو رہی تھی اپنے معاشرے میں میرے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا!!

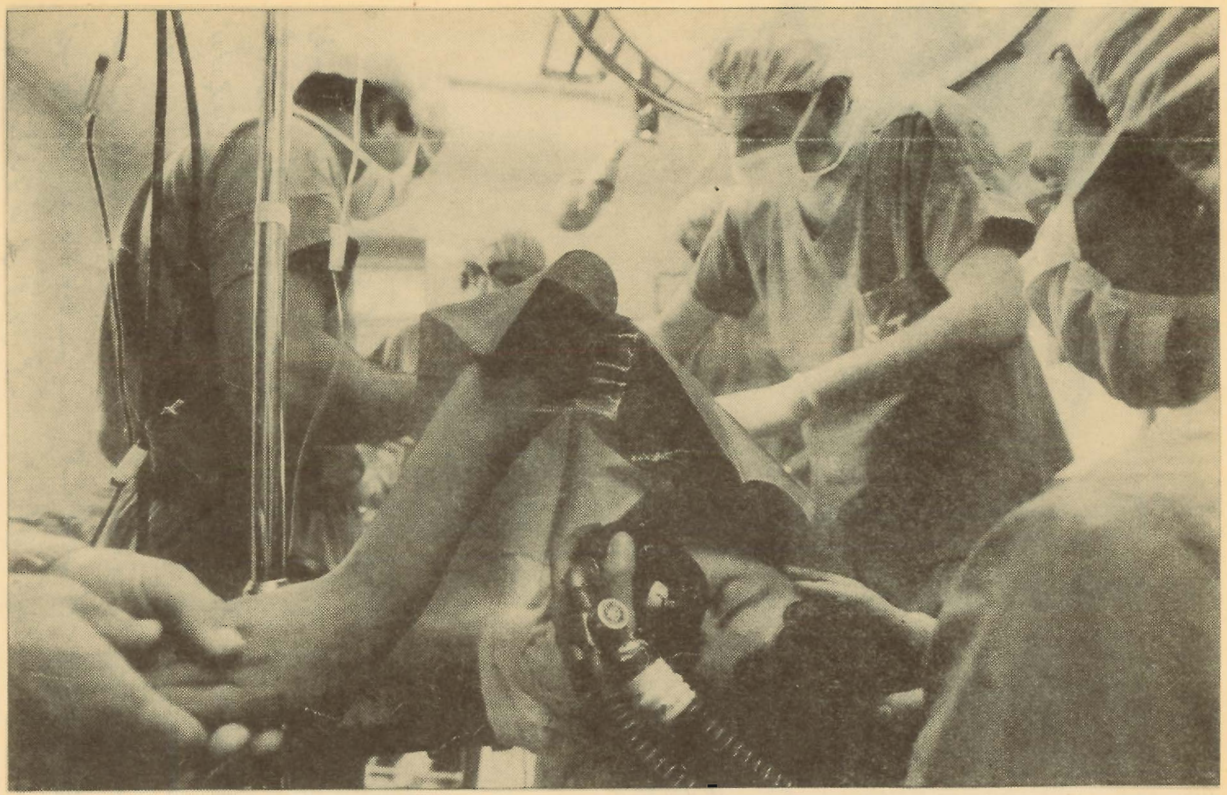

افغانستان میں ایک بچے کا آپریشن ہورہا ہے جو اپنوں ہی کی لگائی ہوئی بارودی سرنگ پھٹنے سے شدید زخمی ہوگیا۔

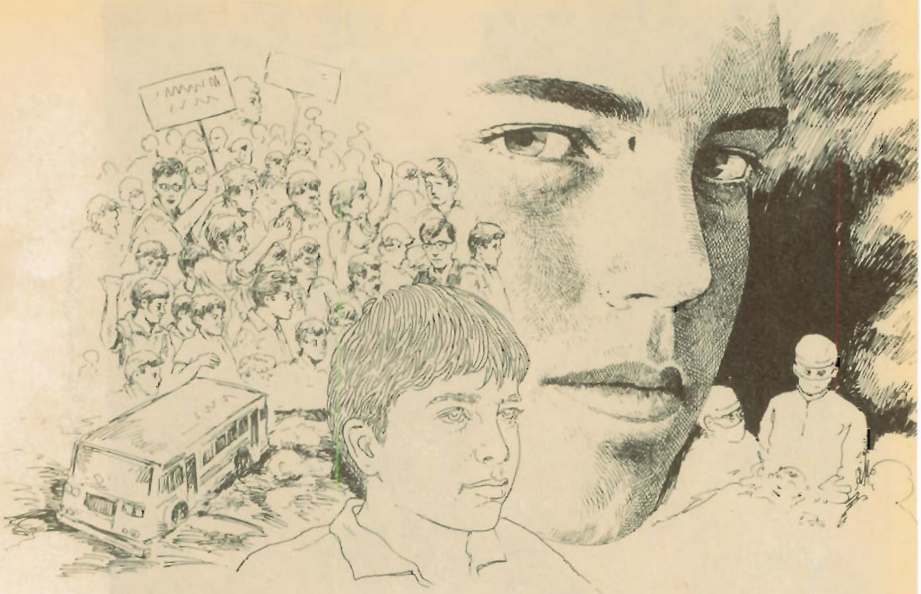

چیخیں

محمد مجاہد منہاس

چیخیں بُلند ہوئیں۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا یہ میرا گھر نہ تھا بلکہ میں جنگل میں سو کر اُٹھا تھا۔ میری بھیڑیں میرے اردگرد چر رہی تھیں۔ اسی وقت انہوں نے بھی کان کھڑے کر رکھے تھے۔ میں نے چیخوں کی سمت کا اندازہ لگایا۔ پھر دوڑ لگا دی۔ سڑک کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ ایک بس سڑک کے ساتھ کھڈ میں اُلٹی پڑی تھی۔ مسافر چیخ رہے تھے۔ چلّا رہے تھے جبکہ ایک ٹرک سڑک پر کھڑا تھا۔ اس کا آگے والا حصّہ چکنا چور ہو چکا تھا۔

شور سن کر کچھ اور بھی لوگ جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ میں بھی تیزی سے آگے بڑھا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ مل کر زخمی مسافروں کو باہر نکالنے لگا۔ جب تمام مسافر باہر نکالے جا چکے تو زخمیوں کو ایک ویگن کے ذریعہ قریبی شہر لے جایا

گیا۔ جہاں پر انہیں ہسپتال میں لے جایا گیا۔ معمولی زخمیوں کو مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا۔ جبکہ شدید زخمیوں کو ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ میں ان کے پاس رہ گیا۔ باقی سب لوگ چلے گئے۔

ایک بزرگ ہوش میں نہیں آ رہے تھے۔ میں ان کے سامنے بنچ پر بیٹھا تھا۔ ان کے بازو میں ڈرپ کی سوئی داخل تھی۔ پیلے رنگ کا محلول ڈرپ سے ان کے بازو میں تیزی سے منتقل ہو رہا تھا۔ میں نے آگے جھک کر ان کے بازو کو چھوا۔ نبض چل رہی تھی۔ اسی لمحہ ایک نرس آئی۔ اس نے انجیکشن بھرا اور بزرگ کو لگا دیا پھر فائل اُٹھا کر کچھ نوٹ کیا اور چلی گئی۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنے کی زحمت ہی نہ کی۔ بلکہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے بزرگ کی صحت یابی کے لئے دعا مانگنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بزرگ کے لب تھرتھرائے۔

را..... راشد میرے پوتے راشد۔"

اسی لمحہ ڈاکٹر صاحب اور نرس بیڈ کے قریب آئے۔ بزرگ کے ہلتے لب دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ بزرگ اب مزید بولنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب!" وہ بولے "میرا پوتا کیسا ہے؟"

"ہائیں....." نرس حیران ہوئی "آپ کا پوتا؟"

"ہاں! بس میں میرے ساتھ تھا۔" بزرگ بولے۔

نرس نے مریضوں کی لسٹ چیک کی۔ اس میں راشد نام کا کوئی مریض نہ تھا۔ "راشد" ذہن میں گونجتا نام میرے لب پر آ گیا۔ میں نے سوچا۔ تمام مردہ اور زخمی مریض تو ہم ہسپتال لے کر آ گئے تھے۔ جائے حادثہ پر کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا۔ جو صحیح سلامت تھے وہ دوسری بس میں سوار ہو کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ لیکن راشد؟ شاید میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا' افراتفری سے فائدہ اٹھا کر کوئی راشد کو اغوا کر کے نہ لے گیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں تیزی سے ہسپتال سے نکل کر تانگہ اسٹینڈ کی طرف آیا اور اس میں سوار ہو کر جائے حادثہ کی طرف بڑھنے لگا۔

حادثے کی جگہ پہنچ کر آگے پیچھے اندر باہر غرض ہر طرف دیکھا لیکن مجھے راشد یا راشد کی لاش نظر نہ آئی۔ اب مجھے پختہ یقین ہو چلا تھا کہ اسے کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے۔ میں بے چین ہو گیا۔ دل نے کہا۔ "تھانے جا کر راشد کی گمشدگی کی رپٹ درج کرا دو۔" لیکن ذہن نہ مانا۔ دماغ نے کہا۔ "تیرے دو ہاتھ ہیں تو خود راشد کو تلاش کر۔" تھانے جائے گا تو تھانیدار تجھے بھی تفتیش میں شامل کر لیں گے۔ بالآخر

ذہن کا فیصلہ دل کے فیصلہ پر حاوی ہوگیا۔ میں تھانے جانے کی بجائے واپس ہسپتال کی طرف چل پڑا۔

وارڈ میں داخل ہوا تو بزرگ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جب بھی وہ ذرا سنبھلتے اپنے پوتے راشد' کے بارے میں پوچھتے' اپنے بال نوچتے اور پکارتے "میرا راشد مجھے لادو۔ مجھے بتاؤ بولو راشد کہاں ہے؟" ان کی درد ناک آواز سن کر میرا دل بھر آیا' میں نے ڈسپنسر کو ساتھ لیا اور جائے حادثہ پر پہنچا۔

آس پاس کے ڈیروں سے میں نے آدمی بلائے۔ خود اپنے ڈیرے پر جاکر رسہ اور دو کسیاں لے کر آیا' کسی کی مدد سے بس کے اطراف سے مٹی ایک طرف کی۔ اور بس کے ساتھ باندھا۔ سب نے مل کر زور لگایا۔ کافی تگ و دو اور محنت کے بعد بس سیدھی ہوگئی۔ ایک آدمی چلّایا "لاش" میرا دل بیٹھنے لگا۔ ڈسپنسر لڑکا تیزی سے آگے بڑھا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ ڈسپنسر نے اس کی نبض ٹٹولی اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے راشد کو ہاتھوں پر اُٹھالیا۔

راشد کو لے کر ہم ایمرجنسی میں داخل ہوئے اور اس کو بیڈ پر لٹادیا۔ اسی لمحہ ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے راشد کو چیک کیا۔ اسے چند انجیکشن لگائے۔ اور اس کے زخمی بازو پر پٹی کردی۔ چند لمحے بعد راشد کو ہوش آگیا۔ راشد کے گھر والے بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے تفصیل سے معلومات کیں۔ ڈاکٹر نے انہیں بتایا اور وہ مطمئن ہوگئے۔ راشد دادا جان کے کمرے میں داخل ہوا وہ بہت خوش ہوئے۔ اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی روز بعد دادا جان بھی فارغ ہوگئے۔ وہ سب اپنے گھر چلے گئے۔ اور میں بھی اپنے گھر آگیا۔

یکم ستمبر کی صبح تھی۔ میں تیاری میں مصروف تھا۔ آج پورے ایک ہفتہ بعد کالج اور اسکول کُھل رہے تھے۔ کتابیں اُٹھا کر میں بس اسٹاپ پر پہنچا۔ اور بس میں سوار ہو کر کالج پہنچا۔ اعجاز سے ملاقات ہوئی۔ سلام دُعا کے بعد بولا۔

"آج چھٹی کے وقت ہڑتال کروانی ہے"

"خیر تو ہے ..... کیا سانحہ ہوگیا ہے؟" میں نے حیرانی کے عالم میں پوچھا۔

"کیا پوچھتے ہو۔ ڈاکٹروں کی غفلت ہے" وہ منہ بنا کر بولا۔

"پھر بھی کُھل کر بتاؤ" میں نے کہا۔

"کالج کے کلرک کا لڑکا ڈاکٹروں کی غلط تشخیص سے مرگیا ہے۔" وہ بولا۔

"کیا نام تھا اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"جوہر میموریل اسکول میں پڑھتا تھا۔ راشد

تھا نام اس کا....." وہ دو ٹوک بولا۔

"ہائیں ..... راشد" میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔

"ہاں راشد" اس نے کہا۔

"دوست تفصیل سے بتائیں اس کے بارے میں۔ ڈاکٹروں کی غفلت سے وہ کیسے مرا؟" میں نے اصرار کیا۔

راشد اپنے دادا جان کے ہمراہ قائد آباد جارہا تھا کہ راستے میں بس کو حادثہ پیش آگیا....." "اچھا تو راشد اپنے کالج کے کلرک کا بیٹا تھا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا لیکن اعجاز نے بات جاری رکھی۔

مرہم پٹی کے بعد راشد اپنے دادا کے ساتھ گھر واپس آگیا تھا۔ ایک ہفتے بعد راشد کی پٹی کھلنا تھی اور تازہ پٹی ہونی تھی۔ وہ پورے ایک ہفتہ بعد ہسپتال گئے۔ ڈاکٹر نے پٹی کھولی تو دنگ رہ گیا۔ زخم خراب ہوچکا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے ابو کو بتایا۔ وکیل صاحب زخم خراب ہوچکا ہے۔ ڈیزل اور موبل آئیل زخم میں گھس چکا ہے۔ کام مشکل تو نہیں لیکن آپ کو بڑے ہسپتال میں جانا ہوگا۔" اس کے ابو نے ریفریلیٹر لیا اور راشد کو بڑے ہسپتال لے گئے۔ وہاں کے ڈاکٹر نے راشد کو داخل کرلیا۔ زخم صاف کر کے پٹی بھی کردی گئی۔ دو دن بعد ڈاکٹر صاحب نے پٹی کھولی۔ زخم بدستور خراب ہورہا تھا۔ ڈاکٹر نے راشد کے والد سے اجازت لے کر راشد کا کہنی تک بازو کاٹ دیا۔ ایک ہفتے بعد پٹی کھولی گئی۔ لیکن زخم بھی مندمل نہیں ہورہا تھا۔ اب ڈاکٹر نے کاندھے تک بازو کاٹ دیا۔ ڈاکٹر یہ سب کام راشد کو بے ہوش کر کے کرتے تھے۔ اسے پھر بہت تکلیف بھی تھی ایک دن راشد کو دوران پٹی ہوش آگیا وہ اپنا کٹا ہوا بازو دیکھ کر ایسا چیخا کہ لوگ تھرا گئے آدھ گھنٹے بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ اعجاز کی باتیں سن کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ڈاکٹروں کے خلاف ایک نفرت سی دل میں بھر گئی۔ میں اعجاز کا حامی ہوگیا۔ ہم نے پہلے دن بڑی کامیاب ہڑتال کی۔ ایک گھنٹے تک جی ٹی روڈ کو بلاک کئے رکھا۔ دوسرے دن ہم نے پوری ہڑتال کی۔ ہم نے تمام اسکولوں اور کالجوں کو بھی ساتھ ملایا اور پورے شہر میں احتجاجی مظاہرہ کرتے رہے۔ لیکن ان ہڑتالوں

نیک انسان

سورج خود بخود کنول کا پھول کھلا دیتا ہے چاند اپنے آپ چاندی پھیلا دیتا ہے بادل بغیر مانگے ہی پانی برسا دیتا ہے اس طرح نیک انسان بھی بغیر کہے خود بخود دوسروں کی مدد اور بھلائی کے کام کرتا ہے۔

مرسلہ... اسداللہ، کراچی

سے انتظامیہ کے سر پر جوں تک نہ رینگی۔ تیسرے دن لڑکے ہم سے بے قابو ہوگئے۔ انہوں نے کچہری میں جاکر بنچوں اور سائن بورڈوں کو توڑا۔ دفتروں کو نقصان پہنچایا۔

ایس پی صاحب ملاقات کے لئے آئے تو ان کے خلاف نعرے بازی کی گئی۔ اور کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا۔

ہڑتالی جلوس واپس کالج کی طرف آنے لگا۔ اسی وقت ریل گاڑی کی وسل سنائی دی۔ اسٹوڈنٹ دوڑ پڑے ہم نے انہیں روکا لیکن وہ نہ رُکے۔ انہوں نے لائن پر پتھر اُٹھالیے۔ اور ریل گاڑی جونہی قریب آئی۔ اس پر پتھراؤ شروع کردیا۔

ریل کے ایک ڈبے میں کچھ زیادہ پتھر گرے۔ اُدھر سے چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے دیکھا جس ڈبے میں سے چیخیں بلند ہورہی تھیں اس کے باہر بینر لٹک رہا تھا جس پر لکھا تھا "یومِ اطفال"

یہ چیخیں سُن کر میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ میں نے سوچا۔ چیخوں کی وجہ چیخیں کیوں ہیں؟" ایسی ہڑتال کا کیا فائدہ جس سے مسائل حل نہ ہوسکیں؟ یہ سوچ ذہن میں آتے ہی میں پتھراؤ کرنے والے گروہ سے باہر نکل آیا!!

مفرّح و مقوّی قلب ہے

معدہ اور دماغ کو

طاقت بخشتا ہے

احمد کا

مُربّہ گاجر

بینائی میں طاقت
ذائقہ اور غذائیت

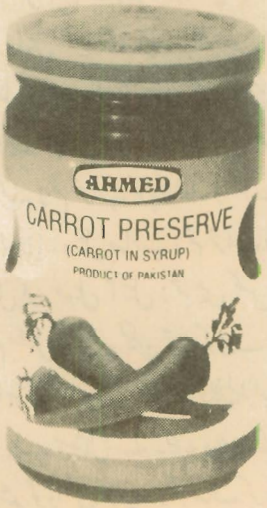

قدرت کا کرشمہ

ظل ہما

ڈاکٹر مارفن امریکہ کی یونیورسٹی میں میڈیکل کا طالب علم تھا۔ اس کا نظریہ شروع ہی سے بڑا تھا۔ جب بھی کوئی ناقابل علاج مریض اس کے پاس آتا یا کسی اپاہج اور لولے لنگڑے پر اس کی نظر پڑتی وہ سوچنے لگتا ان لوگوں کے وجود کا کیا فائدہ؟ یہ نہ صرف اپنے معاشرے پر بار ہیں، بلکہ خود بھی تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسی زندگی سے نجات دلانے کے لئے انہیں ختم کر دینا چاہئے۔

ایک رات ڈاکٹر مارفن ہسپتال میں ڈیوٹی پر تھا کہ اسے بتایا گیا کہ ایک عورت کی حالت نازک ہے۔ ڈاکٹر مریضہ کے پاس پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد عورت نے ایک بچے کو جنم دیا۔ مارفن نے دیکھا بچہ بالکل زرد ہے اور اس کی ایک ٹانگ بہت چھوٹی ہے۔ اس کے ذہن میں فوراً" یہ بات ابھری۔ "یہ بچہ دنیا کے لئے بیکار ہے۔ خود اپنے لئے بھی اس کی زندگی مصیبت ہو گی کیوں نہ اسے ختم کر دیا جائے۔" مگر اگلے ہی لمحے اس پر رحم کا

جذبہ غالب آگیا۔ اس نے بچے کو بچانے کی پوری کوشش کی۔ آخر کامیاب ہوگیا۔ بچے کے چہرے پر سرخی آچکی تھی۔ اور وہ سانس لینے لگا تھا۔ اس کا نام کلر رکھا گیا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ ڈاکٹر اپنے فرائض میں منہمک رہا اور اسی نظریے پر قائم رہا مگر ایک حادثے نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

ڈاکٹر کا اکلوتا بیٹا اور اس کی بیوی کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے اور اپنے پیچھے صرف آٹھ سال کی ایک بچی چھوڑ گئے۔ ڈاکٹر مارفن کو اس بچی سے بے انتہا پیار تھا۔ در حقیقت اب وہی اس کی زندگی کا سرمایہ تھی۔ چنانچہ اس کی دیکھ بھال خوب اچھی طرح کرتا۔

قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہوتے ہیں اور ان میں انسان کی تنبیہہ اور ہدایت کا سامان بھی۔ ایک صبح بچی اٹھی۔ تو اس نے اپنے دادا سے شکایت کی کہ اس کے گلے اور بدن میں رات بھر شدید درد ہوتا رہا ہے۔ ڈاکٹر نے فوراً علاج معالجہ شروع کیا، مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بچی کی بیماری بڑھتی چلی گئی اور پھر وہ شدید قسم کے فالج میں مبتلا اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی۔ ڈاکٹر کو بہرحال اس کی زندگی عزیز تھی۔ وہ اسے لے کر بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس پہنچا۔ مگر ہر ایک نے یہی جواب دیا۔ "ابھی تک اس مرض کا شافی علاج دریافت نہیں ہوسکا ہے۔" ایک روز وہ پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ کسی نے بتایا، "اس مرض کا علاج ایک نوجوان ڈاکٹر کلر نے دریافت کرلیا ہے۔" مارفن فوراً بچی کو لے کر کلر کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر نے اپنے کمرے سے نکل کر مارفن کا استقبال کیا۔ مارفن نے دیکھا، ڈاکٹر لنگڑا ہے۔ کلر بولا

"تشریف رکھئے ڈاکٹر، میں نے اس مرض کا شافی علاج دریافت کرلیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں پیدائشی طور پر لنگڑا تھا۔ ایک رحمدل ڈاکٹر کی کوششوں سے زندہ بچا۔ یہی واقعہ میرے لئے تجسس کا باعث بنا اور آخر کار میں نے شدید فالج کا علاج دریافت کرلیا۔"

ڈاکٹر مارفن پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اسے فوراً خیال آیا۔ "یہ وہی لنگڑا بچہ ہے جو ہسپتال میں پیدا ہوا تھا اور جسے اس نے محض جذبہ رحم کے غالب آجانے کی وجہ سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ آج وہی بچہ اس کی اپاہج بچی کو نئی زندگی عطا کررہا تھا۔

اب اس کے خیالات یکسر بدل چکے تھے اور وہ سوچ رہا تھا "بے شک انسان اپاہج ہو تو کوئی حرج نہیں مگر اسے آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا نہیں ہونا چاہئے۔" مارفن کی بچی اس ڈاکٹر کے علاج سے صحت یاب ہوئی جسے پیدائش کے وقت اس نے بے کار اور ناکارہ تصور کیا تھا۔

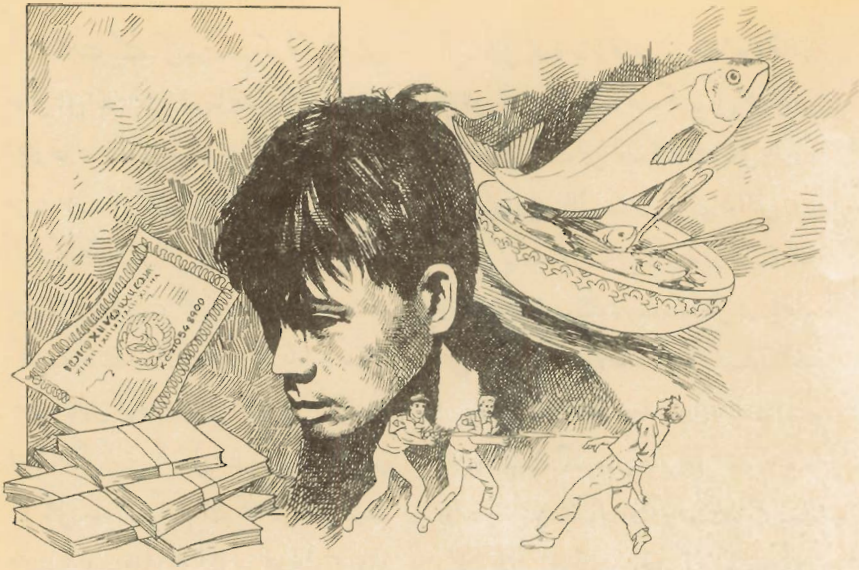

طائی کو کس نے مارا تھا

ایک جاپانی کہانی

عائشہ بلگرامی

جاپان کے ایک قصبہ میں دنیا کی لذیز ترین مچھلی "پفر" جسے مقامی لوگ "فیوگو" کہتے ہیں پائی جاتی ہے۔ مگر اس کا عیب یہ ہے کہ یہ بہت ہی زہریلی ہوتی ہے۔ جاپانی اس کا زہر ختم کر کے اس کو کھاتے ہیں مگر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ زہر کی رتی بھر مقدار بھی باقی رہ جانے سے وہ شخص جو ابھی آرام سے مچھلی کھا رہا ہوتا ہے لمحہ بھر میں ڈھیر ہو جاتا ہے۔

یہاں کے لوگ فیوگو مچھلی سے بے انتہا عشق رکھتے ہیں اور یہاں کے ہر دوسرے شخص کی بڑی خواہش صرف فیوگو کھانا ہے حالانکہ یہ مچھلی بڑی مہنگی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی فیوگو سے محبت کا عکس یہاں کی روایتی کہانیوں میں ملتا ہے۔ ایسی ہی ایک قدیم کہانی ہم آپ ساتھیوں کے لئے پیش کر رہے ہیں!!

بہت پہلے کی بات ہے کہ ٹوکیو شہر میں سوان نامی ایک یتیم لڑکا رہتا تھا۔ وہ بھری دنیا میں اکیلا تھا۔ نہ تو وہ دوسرے جاپانی بچوں کی طرح مزے مزے کی کتابیں پڑھتا اور نہ ان کی طرح گرم کپڑے تھے! اکثر سردیوں کی شاموں میں جب طائی برف باری سے ٹھٹھر رہا ہوتا تو وہ کسی بڑے گھر کے سامنے دروازے پر ہی بیٹھ جاتا۔ ننھا طائی جب مکانوں کی کھڑکیوں میں اندر جھانکتا تو اسے اندر مامتا کی گرمی نظر آتی جہاں مائیں اپنے بچوں کو مچھلی کے گرم گرم قتلے کھلاتیں اور مزے مزے کا سوپ پلاتی نظر آتیں۔ ننھا طائی بس دیکھ کر رہ جاتا پورے گاؤں میں اس کا ہمدرد بوڑھا مچھیرا چونگ ہیٹو تھا۔ جو اسے اپنے ساتھ مچھلی کے شکار پر لے جاتا تھا۔ جہاں وہ دوسرے مچھیروں کے ساتھ مل کر جاپانیوں کی مرغوب مچھلی "فیوگو" کا شکار کرتے اور تمام مچھلیاں اکھٹی کر کے ایک ٹرک میں لاد دی جاتیں۔ چونگ نے طائی کو بتایا تھا کہ یہ مچھلیاں شہر جاتی ہیں جہاں ہوٹلوں میں انہیں صرف امیر اور عالیشان کپڑوں والے لوگ ہی کھا سکتے ہیں۔ چونگ نے طائی کو یہ بھی بتایا کہ یہ مچھلی اتنی مزے کی ہوتی ہے کہ دیوتا بھی اسے کھاتے ہیں مگر یہ زہریلی بہت ہوتی ہے۔ بوڑھا چونگ بڑی احتیاط سے یہ مچھلیاں شکار کرتا تھا۔ کیونکہ ذرا سی غفلت سے کسی کی جان جا سکتی تھی۔ طائی چھوٹا سا تو تھا ہی اور جتنا چھوٹا تھا اتنا ہی اس کا دل بھی چھوٹا تھا۔ مگر یہ دل محرومیوں اور خواہشوں سے لبریز تھا۔ جیسے جیسے طائی بڑا ہوتا گیا ویسے ویسے طائی کے دل میں یہ خواہش زور پکڑ گئی کہ وہ کبھی نہ کبھی فیوگو ضرور کھائے گا۔ بوڑھا چونگ اب چلنے پھرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کی جگہ اب پندرہ سالہ طائی کام کرنے لگا تھا۔ اب طائی نے یہ سوچا کہ وہ اب بڑا ہو گیا ہے اسے شہر جانا چاہئے تاکہ وہاں جا کر اور محنت کر کے دولت کمانی چاہئے تاکہ وہ فیوگو کھا سکے۔ جس کے لئے وہ بچپن سے تڑپ رہا تھا۔ آخر ایک دن اس نے شہر جانے کا ارادہ کر ہی لیا۔ اس بات کا اظہار طائی نے چونگ سے بھی کیا۔ شفیق چونگ نے اسے بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ ایک دن جب دسمبر کی ۱۲ تاریخ تھی اور خوب برفباری ہو رہی تھی طائی اپنا مختصر سا سامان لے کر گاؤں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا۔ شفیق چونگ اپنی پرانی گرم چادر جو اس سردی سے لڑنے کا حوصلہ ہار چکی تھی۔ اپنے گرد مضبوط لپٹے ہوئے طائی کو الوداع کہہ رہا تھا اور پھر چونگ کا سایہ دھندلا دھندلا ہونے لگا اور ہوا کے سرد جھونکوں نے اس دھندلے سائے کو ختم کر دیا۔ طائی کو اپنی نئی شہری زندگی میں سیٹ ہونے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ مگر یہاں بھی اسے صرف بیگانگی اور تنہائی کا احساس

ہوا۔ شام کو کھلی چھت' صاف آسمان اور خوفناک تاریکی اس کو نگل لینا چاہتی تھی۔

کبھی طائی سوچتا کہ وہ دنیا میں کیوں پیدا ہوا؟ وہ بیکار تھا۔ نہ زندگی کا کوئی مقصد تھا وہ چاہتا تھا کہ اپنی بے فائدہ زندگی کو ختم کرلے۔ مگر وہ مرنے سے پہلے ایک بار "فیوگو" ضرور کھانا چاہتا تھا۔ اس نے کئی بار چچا چونگ کے ساتھ فیوگو پکڑی تھی لیکن اس کا زہر نکالنے کا طریقہ نہ تو چچا کو پتا تھا نہ اسے معلوم تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس نے ایک ہی خواہش تو کی تھی جسے بے رحم ماحول نے پورا نہیں ہونے دیا تھا۔ "نہیں! اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ میں مرنے سے پہلے اس کو ضرور پورا کروں گا۔ میں فیوگو کھاؤں گا!" میرے آگے پیچھے ہوٹل کے نوکر بھاگیں گے اور ہاں میں بوڑھے چونگ کو بھی شہر بلالوں گا!..... مگر..... مگر ....." اس نے خیالی پلاؤ پکانا بند کردیا۔

کہتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ خواب مرجاتے ہیں لیکن طائی کا یہ خواب ہمیشہ زندہ رہا' جو ہر رات کو اس کو سانپ بن کر ڈستا اور وہ خواب تھا "فیوگو کھانا" جب وہ ایک مشہور ہوٹل کے سامنے سے گزرتا جو صرف فیوگو ہی پکاتی تھی' تو اس کا دل چاہتا کہ وہ ان رنگ برنگے شیشوں کو توڑ کر اندر پہنچ جائے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے پاس فیوگو جیسی مہنگی مچھلی کے لئے پیسے نہیں تھے۔ کچھ دنوں میں اس نے پیسے جمع کرکے لاٹری کا ٹکٹ خرید لیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا طائی پاگل ہوا جارہا تھا۔ وہ کیوں زندہ ہے؟ یہ وہ سوال تھا جو طائی کو سانپ بن کر ڈستا۔ آخر عین اس دن جب لاٹری کا نتیجہ نکلنا تھا طائی کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے اپنی بچپن کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہر کام کر گزرنے کا فیصلہ کرلیا۔

طائی کی نظر بار بار اس عمر رسیدہ عورت کے "پرس" پر پڑ رہی تھی۔ جو عالیشان لباس میں ملبوس محو گفتگو تھی۔ دفعتاً طائی کے قدم بجلی کے سرعت سے اُٹھے اور فوراً" ہی طائی نے اس عورت کا پرس جھپٹ لیا۔ "پکڑو ..... پکڑو!!" عورت چیخنے لگی۔ طائی تمام فکروں سے بے نیاز اسی ہوٹل کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ جہاں اس کی کشش کا تمام سامان مہیا تھا۔ پرس میں بڑا مال تھا۔ اس نے ہوٹل کے بیروں سے "فیوگو" کھانے کی خواہش ظاہر کی لیکن انہوں نے اس کے پھٹے پُرانے کپڑوں اور ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکال دیا تب غصّے میں آکر طائی نے پرس پھینک دیا اور ہوٹل کے پچھلے راستے سے ہوٹل کے باورچی خانے میں پہنچ گیا۔

باورچی خانے میں طرح طرح کی فیوگو مختلف ڈشز میں سجی تھیں اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ طائی

بے سوچے سمجھے "فیوگو" کے گوشت پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ کبھی اِس ٹرے میں کبھی اُس ٹرے میں اس کی آنکھوں کے سامنے بچپن سے اب تک محرومیوں کے تمام واقعات گردش کر رہے تھے۔ وہ فیوگو جلدی جلدی کھانے لگا۔

"ارے پکڑو! چور چور!!"

باورچی نے اندر قدم رکھتے ہی چیخنا شروع کردیا۔ طائی نے تیزی سے باہر کا رخ کیا مگر باہر پولیس اس کے انتظار میں موجود تھی "رُک جاؤ طائی!" پولیس کی گاڑی نے اسے وارننگ دی۔ "ایک! دو! تین!!" اس کے ساتھ ہی پستول نے ایک شعلہ اُگلا اور گولی طائی کے سینے میں پیوست ہوگئی اور یوں محرومیوں اور نفس کے شکنجوں میں جکڑا ہوا وجود محض گوشت کا ڈھیر بن گیا۔

دوسرے دن طائی کی موت کی تحقیقات ہوئیں۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق طائی کی موت "فیوگو" کے زہر سے ہوئی مگر اخبار میں جو خبر چھپی وہ یہ تھی "تین لاکھ ڈالر کا مالک بدقسمت طائی سوان پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ یہ تین لاکھ ڈالر طائی نے اس ہی دن لاٹری کا پہلا انعام ملنے پر حاصل کیے تھے۔ مزید تحقیقات جاری ہیں" آہ! بدقسمت طائی مگر نہ تو طائی زہر سے ہلاک ہوا نہ پستول سے۔ اسے اس کے نفس نے مار ڈالا تھا۔

مخیّر حضرات توجہ فرمائیں!

یہ پیاری سی بچی نگہت بانو پانچ سال سے بلڈ کینسر کی ایک قسم "تھیو سو فیلیا" میں مبتلا ہے۔ ہر بیس بائیس دن بعد اس کے جسم کا خون تبدیل کیا جاتا ہے۔ جب خون پرانا ہونے لگتا ہے تو اس بچی کا رنگ پیلا پڑتا جاتا ہے' کھانا پینا چھوڑ دیتی ہے' چلتے چلتے گر پڑتی ہے اور بخار بھی ہوجاتا ہے۔ اس بچی کا علاج لندن کے ہسپتال میں ممکن ہے لیکن علاج کے اخراجات اس کے گھر والے اُٹھا نہیں سکتے۔ نگہت بانو کے والد جناب گل شاداب ڈسٹرکٹ جیل گجرات میں راج مستری کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لندن کے ہسپتال کے مطابق چالیس ہزار برطانوی پونڈ جو کہ پاکستانی بیس لاکھ روپے بنتے ہیں پیشگی جمع کرائے جائیں تو نگہت بانو کا علاج شروع کیا جاسکتا ہے..... نگہت بانو کی جان بچانے کے لئے مخیّر حضرات سے تعاون کی درخواست ہے ..... اپنے عطیات اور رقوم آنکھ مچولی کی معرفت یا پھر درج ذیل پتے پر ارسال کیجئے :

گل شاداب اکاونٹ نمبر 599' مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ جلال پور جٹاں برانچ' ضلع گجرات (پاکستان)

واقعی سہولت تو حبیب بناسپتی کی ہے

صارفین کی سہولت کے لئے آسانی سے کھلنے اور بند ہونے والا ڈھکنا اور اس کے نیچے نرم فوائل کی سیل جس کی بدولت حبیب بناسپتی کی اعلیٰ کوالٹی اور تازگی آخر تک برقرار۔

بہتر تو تھا ہی اب سب سے بہتر ہے

فرقان وہاب کی شوخیاں

تھالیڈومائیڈ

جس نے لاکھوں بچوں کو معذور کر دیا

شگفتہ سناز

سائنس پیسے کمانے کے لئے نہیں، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ہے!

شعبۂ طب میں سائنس بہت آگے نکل گئی ہے۔ پہلے کبھی تپ دق کا علاج کامیاب نہیں تھا۔ اب کہا جاتا ہے کہ تپ دق لاعلاج مرض نہیں۔ سائنس کے ذریعے لاعلاج کو شفا مل رہی ہے۔ اندھوں کو آنکھوں، بہروں کو کان اور لنگڑے لولوں کو ٹانگیں مل رہی ہیں۔ سرجری نے حیرت انگیز حد تک ترقی کرلی ہے۔ دماغ کا آپریشن ہو سکتا ہے، دل تبدیل کیا جاسکتا ہے ..... اور اب سائنس موت پر قابو پانے کا سوچ رہی ہے۔

بعض اوقات ناجائز منافع خود یا راتوں رات امیر ہونے والے طب میں اس قسم کی جعلی دوائیں تیار کرواتے ہیں جن کے فائدے بہت کم اور نقصان بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

ایسی ہی چند ادویات آج سے چند سال پہلے "تھالیڈومائیڈ" کیمیائی مرکب کے مختلف ناموں سے بازار میں آئیں تو لوگوں نے اسے ہاتھوں

ہاتھ لیا۔ تھالیڈو مائیڈ کی تمام ادویات عورتوں کے امراض کے لئے تیار کی گئی تھیں۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ادویات آگے چل کر بنی نوع انسان کے لئے ایک ایسا مسئلہ پیدا کردیں گی جس کا مدوا انسانی طاقت سے باہر ہوگا۔ جلد ہی تھالیڈو مائیڈ کے نقصانات ظاہر ہونے لگے۔ جن ماؤں نے یہ دوائیں استعمال کیں ان کے ہاں نامکمل اعضا والے بچے پیدا ہوئے کسی بچے کے دونوں بازو غائب ہیں تو کسی کی دونوں ٹانگیں نہیں۔ کسی کے کان دکھائی نہیں دیتے تو کسی کی ناک ندارد۔ بعض بچوں کے صرف ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ تھی۔ یہ بچے پیدا ہوتے رہے لیکن کسی نے تھالیڈو مائیڈ کو ذمہ دار نہ ٹھہرایا۔ صرف جرمنی میں تین سال کے اندر پانچ ہزار سے زائد نامکمل اعضا والے بچے پیدا ہوئے۔

اس روز افزوں تعداد سے یورپ میں خوف اور دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کمزور عقیدہ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بنی نوع انسان پر کوئی آسمانی آفت نازل ہوئی ہے اور یہ بچے اصل میں والدین کے گناہوں کی پاداش ہیں۔ لیکن ماہرینِ طب اس خیال سے متفق نہ تھے۔ تحقیقات شروع ہوئیں اور سب سے پہلے جرمنی کے چند ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب کچھ تھالیڈو مائیڈ استعمال کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس دوران میں قسم قسم کے بچے دیکھنے میں آئے۔ بعض بچوں کی انگلیاں شانوں سے جڑی ہوئی تھیں بعض کے ہاتھوں میں صرف ایک ایک اُنگلی تھی۔ بعض کے پاؤں میں دو سے لے کر چار تک اُنگلیاں تھیں۔ کچھ بد قسمت ایسے بھی تھے کہ جن کے بازو تھے نہ ٹانگیں۔ بے چارے گوشت کا ایک لوتھڑا معلوم ہوتے تھے۔ جرمن ڈاکٹروں نے بہتیرا شور مچایا۔ لیکن کسی نے ان کی ایک نہ سنی۔ تھالیڈو مائیڈ تیار کرنے والی فرمیں یہ ماننے پر ہرگز تیار نہ تھیں کہ ان کی دوائیں اس درجہ مُہلک ثابت ہوسکتی ہیں۔ آخر جرمنی کی طبی کونسل نے حکومت سے مدد کی درخواست کی۔ حکومت کے توسط سے یہ فرمیں اس بات پر رضا مند ہوگئیں کہ وہ جلد سے جلد بازار میں موجود اپنی منصوعات واپس منگوالیں گی۔ لیکن ادویات واپس منگوانے کا کام کئی ماہ میں پورا ہوا۔ اس دوران میں اخباروں اور ریڈیو سے متعدد بار اعلان کیا گیا کہ عوام تھالیڈو مائیڈ کے استعمال سے گریز کریں لیکن تھالیڈو مائیڈ ادویات دور دور تک پھیل چکی تھیں۔ جرمنی، انگلستان، کینیڈا، ریاستہائے متحدہ امریکہ، پرتگال، سوئیٹزرلینڈ، آسٹریلیا اور جاپان کے بازاروں میں یہ دوائیں دھڑا دھڑ بک رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ تھالیڈو

مائیڈ کے نقصانات ہر خاص و عام پر واضح ہوتے گئے۔

مائیں اپنے معذور بچّوں کو دیکھ کر خوف و افسوس کے مِلے جلے جذبات سے سکتے میں آگئیں، بہت سی ماؤں نے خود کشی کرلی۔ کئی عورتوں نے اپنے بچّوں کو قتل کرنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن آہستہ آہستہ انہیں صبر آہی گیا۔ آخر یہ بچّے ان کا خون تھے۔ ان کے ننھے ننھّے سینوں میں دھڑکنے والے دل ان کے اپنے دلوں کا ایک حصّہ تھے۔ جدید سائنس ان ننھے منے بچوں کے مرض کی ذمّہ دار تھی۔ سائنس دانوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ اس مسئلے کا کوئی حل دریافت کیا جائے چانچہ مصنوعی اعضا تیار کئے گئے۔ ان اعضا میں بازو اور ٹانگیں قابل ذکر ہیں۔ یہ مصنوعی اعضا جنگ عظیم کے بعد ایک جرمن فوجی ڈاکٹر "گوئز کوھن" نے ایجاد کئے تھے۔ بعد میں تھالیڈو مائیڈ سے پیدا ہونے والے بچّوں کے لئے استعمال ہونے لگے۔

جرمن سائنسدانوں نے تھالیڈو مائیڈ کے استعمال سے مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں بہت سی تحقیقات کی ہیں۔ تھالیڈو مائیڈ پر دن رات اب بھی تجربات ہورہے ہیں۔ ان تجربات سے بہت مُفید نتائج کی توقع ہے۔ ادھر سائنس دان اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مصنوعی اعضا کو زیادہ سے زیادہ مُفید دلکش، سستے اور پائیدار بنایا جائے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہے کہ ہاتھوں سے محروم بچّے مصنوعی اعضا کے باوجود بھی دوسروں کے محتاج رہتے ہیں۔ یہ کمی کیسے پوری کی جائے۔ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے ہاتھ اور پاؤں سے محروم بچّہ ایک کام کا صرف ارادہ کرے اور مصنوعی اعضا اس کے ذہن کی پیروی کریں۔

کاش! چاند اور ستاروں کی تسخیر کے بجائے دنیا بھر کے سائنس دان مل کر اس ایک بچّے کا دُکھ دور کرسکیں جس کے بازو ہیں نہ ٹانگیں۔ جو دن پھر اپنے بستر پر گوشت کے لوتھڑے کی طرح پڑا رہتا ہے۔ اس عمر میں تو خیر والدین کھِلا پلا دیتے ہیں لیکن جب وہ بڑا ہوگا تو کیا کرے گا؟ کہاں جائے گا؟ کیسے کمائے گا؟؟ اس بے رحم دُنیا میں سوائے بھیک مانگنے کے شاید وہ اور کوئی کام نہ کرسکے اور ستم تو یہ کہ اس کام کے لئے بھی اسے دوسروں کی مدد کی ضرورت ہوگی۔

کیا مستقبل قریب میں سائنس دان اس مسئلے کا حل دریافت کرسکیں گے؟؟

3 بجے کہانیاں

تین بجے تین کہانیاں ہمارے ہی معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں یہ سچی تصویریں نوجوان ادیبوں نے اپنے قلم کے کیمرے سے کھینچی ہیں۔ تین بجے تین کہانیاں کا سلسلہ ہر مہینے ان بچوں بچیوں کی سچی کہانیاں پیش کرے گا جن کے ساتھ اس معاشرے میں ناانصافی ہو رہی ہے۔ جن کے دل کے پھول مُرجھا رہے ہیں جن کا بچپن، جگنو، تتلیاں گم ہو رہی ہیں۔

تین بجے تین کہانیاں کے لئے آپ کا ادیب ہونا شرط نہیں۔ آپ اپنے الفاظ میں تحریر ہمیں لکھ بھیجئے واقعات کی نوک پلک ہم خود درست کرلیں گے۔ تحریریں اس پتے پر ارسال کیجئے :

تین بجے تین کہانیاں ماہنامہ آنکھ مچولی، ای آئی بی کالونی، کراچی

پہلی کہانی

جیری

بختیار احمد

میں نے گاڑی ورکشاپ میں روکی اور نیچے اُتر آیا۔ "ارے ناصر صاحب آپ بڑے دنوں بعد نظر آئے" ورکشاپ کے مالک ارشاد نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "جب گاڑی خراب ہوگی تب ہی آؤں گا ناں۔ تم کیا چاہتے ہو میری گاڑی روز خراب ہو اور میں روز یہاں آؤں" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے نہیں" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اچھا ارشاد تم ذرا گاڑی کو دیکھو دو تین دفعہ راستے میں بند ہو گئی ذرا جلدی کرنا مجھے دفتر پہنچنا ہے۔" میں نے گاڑی کا بونٹ کھولتے ہوئے کہا۔ "ابھی دیکھتا ہوں آپ بیٹھیے۔" ارشاد نے پاس رکھی کُرسی کی طرف اشارہ کیا اور گاڑی کے انجن پر جُھک گیا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر ورکشاپ کو دیکھنے لگا۔ یہاں میں پہلی مرتبہ کئی برس پہلے آیا تھا۔ جب اچانک گاڑی راستے میں خراب ہوگئی تھی اور اس دن کے بعد جب بھی میری گاڑی میں گڑبڑ ہوتی میں یہیں آتا تھا۔ ارشاد سے میری اچھی خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔ ورکشاپ آج بھی ویسے ہی نظر آرہا تھا جیسے ہمیشہ ہوتا تھا۔ دائیں طرف ایک کمرہ تھا جس میں ایک میز اور چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کا سارا فرش اوزاروں اور گاڑیوں

کے پُرزوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے برآمدہ تھا۔ جس میں تین لڑکے زمین پر بیٹھے مختلف انداز میں جھک کر اپنا اپنا کام کررہے تھے۔ برآمدے میں بھی جابجا اوزار اور انجنوں کے حصّے بکھرے پڑے تھے۔ جبکہ باہر صحن میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور اس طرف گیٹ کے سامنے تین کُرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں ایک پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے لڑکوں کو دیکھا جو کام کررہے تھے۔ ان کی عمریں تقریباً" پندرہ بیس کے درمیان لگ رہی تھیں۔ ان سب کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ان کے چہرے ہاتھوں اور میلے کچیلے کپڑوں پر جابجا پٹرول کی چکناہٹ لگی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ سیاہ ہورہے تھے۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں تو نئے لڑکے کام کررہے ہوتے ہیں اور پُرانے غائب ہوچکے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ارشاد سے وجہ پوچھی تو اس نے اچھی خاصی تقریر شروع کردی۔ "وہ سب احسان فراموش کام سیکھ کر چلے گئے دو پُرزے جوڑتے ہی اپنے آپ کو بڑا مکینک سمجھنے لگے۔ کم بخت وہ وقت بھول گئے کہ جب کوئی ان کو کام نہیں دیتا تھا اور میں نے رحم کھا کر انہیں اپنے ہاں کام دیا تھا۔" مگر اس فریاد کے باوجود اس کے پاس کبھی لڑکوں کی کمی نہیں رہی۔ جتنے جاتے اتنے ہی اور آجاتے۔ "ناصر صاحب اب گاڑی اسٹارٹ کریں۔" ارشاد نے مجھے خیالات کی دُنیا سے باہر لا کھڑا کیا۔ "ہوں.... اچھا" میں نے کہا اور اُٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ "یہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے اب انشاء اللہ بند نہیں ہوگی۔" ارشاد بونٹ بند کرتے ہوئے بولا۔ میں گاڑی سے اُترا اور ارشاد کو پیسے دینے لگا۔ میری نظر برآمدے پر پڑی اب وہاں دوسرے لڑکوں کے ساتھ ایک لڑکا اور بیٹھا انجن کے کسی حصّے کو کپڑے سے صاف کررہا تھا۔ اس کی عمر بمشکل آٹھ دس سال ہوگی۔ مجھے بچوں کو کام کرتے دیکھ کر ہمیشہ دُکھ ہوتا تھا۔ مجھے ان کے والدین پر غصّہ آتا تھا جو ان معصوم بچوں سے کام کرواتے تھے اور ان لوگوں پر بھی جو ان کو اپنے پاس کام کے لئے رکھتے تھے۔ "ارشاد یہ چھوٹا سا بچہ بھی یہاں کام کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "جی ہاں" "تم اتنے چھوٹے سے بچے سے کام کرواتے ہو یہ تو ظلم ہے!" "بس کیا کریں جی اس کو رکھنا بڑی مجبوری ہے۔" میں ارشاد سے اس کی مجبوری پوچھنا چاہتا تھا مگر میری نظر گھڑی پر پڑی تو معلوم ہوا کہ مجھے دفتر کو آدھ گھنٹہ دیر ہوچکی ہے اور دفتر پہنچنے میں مزید آدھا گھنٹہ گزر جائے گا۔ اس لئے میں اس بحث کو چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھا اور دفتر کی طرف چل پڑا۔ دفتر پہنچتے ہی میں دفتر کے ہنگاموں میں گم ہوگیا اور ورکشاپ اور بچے کے

بارے میں سب کچھ بھول گیا۔

☆-------☆-------☆

"ارشاد یہ پھر راستے میں بند ہوگئی۔ ذرا اچھی طرح دیکھو اس کو" میں نے ارشاد سے کہا جو ایک گاڑی کا بونٹ کھولے اس پر جُھکا ہوا تھا۔

"گاڑی کو ٹھیک کئے ابھی مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ راستے میں ایک بار پھر بند ہوگئی بڑی مُشکل سے اسٹارٹ کرکے اسے ورکشاپ لایا ہوں۔" میں نے مزید کہا اور ارشاد میرے قریب آگیا۔

"اچھا..... حیرت ہے..... آپ بیٹھئے میں ابھی دیکھتا ہوں۔" ارشاد بولا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ارشاد انجن پر جُھک گیا اور ایک لڑکا اس کو مختلف اوزار پکڑانے لگا۔ "اب اسے پوری طرح ٹھیک کرو ارشاد یہ تو روز تنگ کرنے لگی ہے۔" میں نے "تنگ" پر زور دیا جسے ارشاد نے بھی محسوس کرلیا۔ اس نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔ مجھے ارشاد پر غصّہ آرہا تھا۔ "پیسے تو پورے لیتا ہے اور کام خاک نہیں کرتا۔ ابھی ایک مہینہ نہیں گزرا اور گاڑی پھر خراب" میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ اچانک میری نظر اس چھوٹے بچے پر پڑی جسے میں نے کچھ دنوں پہلے ارشاد کے گیرج پر دیکھا تھا۔ وہ ایک بھاری سا پُرزہ اُٹھائے کمرے کے اندر جارہا تھا۔ پُرزہ کافی بھاری تھا اور وہ بڑی مشکل سے اسے اُٹھا کر لے جا رہا تھا۔ میں اپنا غصّہ بھول کر اسے دیکھنے لگا پھر ارشاد کی طرف دیکھا جو ابھی تک انجن پر جُھکا ہوا تھا۔ "ارشاد تم اس بچے سے اتنا کام کیوں کرواتے ہو۔ اتنا کام تو کوئی بڑا بھی کرے تو تھک جائے۔" "ارے ناصر صاحب!" ارشاد نے انجن پر جُھکے جُھکے بولنا شروع کردیا۔ "میں کہاں کام کرواتا ہوں۔ میرا تو سراسر نقصان ہے۔ کام تو یہ خاک بھی نہیں کرتا اور پیسے پورے لیتا ہے پر کیا کروں میرے رشتہ دار کا بیٹا ہے اس نے مجبور کیا اور مجھے اسے رکھنا پڑا۔" "ہونہہ" میرے منہ سے نکلا۔ "کیا نام ہے اس کا؟" "لطیف!" ارشاد نے جواب دیا۔ میں سوچنے لگا۔ اس بچے کا باپ کتنا ظالم ہے کہ اپنے چھوٹے سے بچے سے اتنا کام کرواتا ہے۔ "ناصر صاحب! اب گاڑی بالکل ٹھیک ہوگئی ہے" ارشاد بونٹ بند کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تو تم پہلے بھی کہہ رہے تھے۔ اب پھر راستے میں بند تو نہیں ہوجائے گی ناں؟" میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں انشاء اللہ اب بالکل ٹھیک رہے گی۔" اچانک کمرے سے ایک چیخ کی آواز آئی لطیف اپنی بائیں کلائی پکڑے باہر نکلا۔ اس کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک بڑا لڑکا بھی تھا۔ "اس کا ہاتھ کار کا انجن گرنے

سے زخمی ہوگیا۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔ ارشاد نے جیب سے رومال نکالا اور اس کی کلائی پر باندھا۔ لطیف درد اور تکلیف کی وجہ سے ہونٹ بھینچے کھڑا تھا۔ رومال خون سے سُرخ ہونے لگا۔ "میں اسے ہسپتال لے جاتا ہوں۔ اس کو گاڑی میں بٹھاؤ" میں نے جلدی سے کہا۔ ارشاد ایک لمحے کو جھجکا اور پھر لطیف کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور سیدھا ہسپتال کی طرف چل پڑا۔

☆-------☆-------☆

"ڈاکٹر صاحب زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ وہ ایک سرکاری ہسپتال کا ایمرجنسی وارڈ تھا۔ ڈاکٹر نے ناک بھوں چڑھا کر میری طرف دیکھا پھر چشمہ ناک کے اوپر کرتے ہوئے نخوت سے کہا "معمولی زخم ہے چند روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر لطیف کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "جب تک زخم ٹھیک نہ ہو جائے اس ہاتھ سے کام نہیں کرانا" "جی" لطیف آہستہ سے بولا "اچھا ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت شکریہ" میں نے اُٹھتے ہوئے ڈاکٹر سے ہاتھ ملانا چاہا لیکن وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں ارشاد کے ساتھ لطیف کا ہاتھ پکڑے باہر نکل آیا۔ "آؤ بیٹا میں تمہیں گھر چھوڑ دوں" میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے باپ سے پوچھوں کہ اسے اپنے بچے کی ذرا بھی فکر نہیں کہ وہ اس سے اس طرح خطرناک کام کرواتا ہے۔ میں نے سوچا کہ لطیف سے پوچھ لوں کہ اس کا باپ اس سے کیوں کام کرواتا ہے مگر پھر میں نے سوچا کہ بچہ ہے اسے کیا پتہ۔ اس کے باپ سے ہی پوچھ لیتا ہوں۔ ارشاد کو گیرج پر چھوڑنے کے بعد لطیف مجھے راستہ بتاتا گیا۔ گاڑی کچھ دیر تک پکی سڑکوں پر چلتی رہی پھر ٹوٹی پھوٹی سڑکیں آئیں تو ایک کچی آبادی کے آثار نمودار ہوئے۔ ٹیڑھے ترچھے مکانات، چھوٹی چھوٹی گلیاں، چھوٹے چھوٹے گھروں سے اُٹھتا ہوا میلا میلا دھواں۔ "گاڑی یہیں روک لیں آگے گلی تنگ ہے آپ کی گاڑی اندر نہیں جاسکے گی۔" بچے کی بات سُن کر میں نے گاڑی گلی کے باہر ہی ایک کونے میں کھڑی کردی۔ ننگ دھڑنگ، کالے کلوٹے، میلے کچیلے بچے بھاگتے ہوئے آگے بڑھے اور بڑی حسرت سے میری چمچماتی گاڑی دیکھنے لگے۔

"دیکھو گاڑی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔" میں نے بچوں کو تنبیہہ کی تو بچے سہم گئے۔ میں نے گاڑی کے شیشے چڑھائے اور گاڑی کو لاک کرنے کے بعد لطیف کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اُتر آیا۔ تنگ گلی میں داخل ہوتے ہی ایک بدبو دار جھونکے نے میرا استقبال کیا۔ میں نے فوراً

جیب سے اپنا رومال نکالا اور ناک پر رکھ لیا۔ گندے پانی کی ایک لمبی سی نالی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ گلی کے کچھ میلے کچیلے بچے نالی کے پاس کھیل رہے تھے۔ چند ایک آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ تنگ گلی کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ ان گھروں کے ایک ہی طرح کے زنگ آلودہ دروازے تھے جو ٹین کے تھے۔ میں نالی سے بچتا بچاتا رومال ناک پر دبائے، لطیف کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ رہا تھا کہ لطیف اُنگلی سے اشارہ کرکے بولا "وہ سامنے میرا ابا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ گلی کے آخر میں ایک چھوٹا سا میدان تھا جس میں ایک بڑے سے درخت کے نیچے، چارپائی پر ایک آدمی لیٹا ہوا تھا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے چارپائی کے قریب پہنچے۔ وہ تقریباً چالیس پینتالیس سال کا آدمی تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر بال اور کہیں کہیں داڑھی سفید ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے پیروں کے اوپر باریک کپڑے کی چادر ڈالی ہوئی تھی۔ "معصوم بچے سے کام کرواتا ہے اور خود آرام سے سو رہا ہے۔" میں نے سوچا۔ "ابا" لطیف اس کے سرہانے جاکر بولا۔ اس نے نے آنکھیں کھولیں۔ لطیف کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار اُبھر آئے۔ وہ ہاتھوں کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اوئے لطیف....." اس کی نظر لطیف کی کلائی پر بندھی پٹی پر پڑی۔ "لطیف کیا ہوا تجھے؟" اس نے لطیف کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "ابا زخم آگیا تھا۔" لطیف بولا "کک .... کیسے؟" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "بچوں سے کام کرواؤ گے تو یہ تو ہوگا۔" لطیف کے بجائے میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میری آواز سے اسے پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا۔ "آپ ..... آپ کون..؟" اس نے پوچھا "ابا! یہ باؤ جی مجھے ہسپتال لے گئے تھے پٹی کرانے اور یہاں چھوڑنے مجھے گاڑی میں لائے ہیں۔" "اچھا اچھا باؤ جی بڑی مہربانی آپ کی ... آؤ... آؤ بیٹھو باؤ جی ... میں رضوان ہوں اس کا باپ" وہ چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ "شکریہ!" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "آپ اس چھوٹے سے بچے سے کیوں کام کرواتے ہیں۔ یہ تو اس کے کھیلنے کے، پڑھنے کے دن ہیں۔ آپ کو اس کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں؟" میری بات سُن کر اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ "باؤ جی میں غریب آدمی اس کو کہاں پڑھا سکتا ہوں اور یہ کام نہیں کرے گا تو پیٹ کیسے بھریں گے۔ میرے پاس تو کوئی کام نہیں۔"

"اگر آپ اس کو پڑھا نہیں سکتے۔ آپ کی مجبوری ہے تو کم از کم اس سے کام تو نہ کروائیں۔ رہا آپ کے کام کا سوال تو آپ مزدوری تو کر سکتے ہیں۔ اگر وہ بھی نہیں تو اس کی جگہ خود کام کریں۔ آپ اس کے باپ ہیں۔ یہ آپ کا فرض ہے۔"

اس نے اپنا سر نیچے جھکا لیا جیسے زمین پر کچھ تلاش کر رہا ہو۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے آہستہ سے اپنے پاؤں پر پڑی چادر ہٹا دی۔ میں نے دیکھا۔ اس کے دونوں پیر گھٹنوں کے قریب سے کٹے ہوئے تھے۔ "میں ویگن چلاتا تھا۔ باؤ جی! تین مہینے پہلے ایکسیڈنٹ میں میرے دونوں پیر کٹ گئے۔ اس کی ماں تو تین سال پہلے ہی مر گئی تھی۔ بس اس کی ایک بہن ہے جو اس سے چار سال بڑی ہے جو گھر بھی سنبھالتی ہے اور میری دیکھ بھال بھی کرتی ہے اور یہ کام کرتا ہے۔ باؤ جی مجھے اور تو کوئی کام نہیں آتا یا گاڑی چلا سکتا ہوں یا مزدوری کر سکتا ہوں اور یہ دونوں کام بغیر پیروں کے نہیں ہوتے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ میں بھی تھوڑی دیر خاموش رہا۔ مجھے اپنے رویہ پر ندامت ہو رہی تھی کہ میں نے حقیقت جانے بغیر نہ جانے لطیف کے باپ کے بارے میں کیا کیا سوچا اور اس سے اس طرح سخت لہجے میں بات کی۔ پھر آہستہ سے بولا "میں..... میں بہت شرمندہ ہوں میں آپ سے....." "ارے نہیں باؤ جی" لطیف کے باپ نے میری بات کاٹی "بچے کو یوں کام کرتے دیکھ کر ہر ایک کو دکھ ہوتا ہے۔ اس میں آپ کا کیا قصور مگر باؤ جی سب سے زیادہ دکھ تو مجھے ہی ہوگا ناں۔ میرا تو بیٹا ہے یہ... باؤ جی ہر باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے پڑھے لکھے، اچھی زندگی گزارے مگر ہر کسی کی خواہش تو پوری نہیں ہوتی ناں۔ مگر..... مگر میں اپنے بچے کو اب اس طرح کام کرتے اور زخم کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں اگر کچھ نہیں کر سکتا تو بھیک تو مانگ سکتا ہوں۔ ہاں میں..... میں بھیک مانگ لوں گا مگر اپنے بچے سے کام نہیں کرواؤں گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے لطیف کو گلے لگا لیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ اسی وقت گندی نالی سے بُو کا ایک جھونکا آیا اور میں نے جھٹ سے رومال ناک پہ رکھ کر اس تنگ گلی سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ میں کچھ کہے بغیر آہستہ سے گندگی کے ڈھیر اور گندے پانی سے بچتا بچاتا اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔ اس دن کے بعد میں جب کبھی کسی بچے کو کام کرتے دیکھتا ہوں تو یہ نہیں سوچتا کہ اس کے والدین کتنے ظالم ہیں۔ بلکہ یہ سوچتا ہوں کہ وہ کتنے مجبور ہیں!!

دوسری کہانی

یہ بچہ کس کا ہے؟

انور کلیم بلوچ

کتاب بند کرکے میں نے طویل سانس لی اور ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بٹن آن کیا۔ خبریں ختم ہو چکی تھیں اور پروگرام "یہ بچہ کس کا ہے؟" کا اعلان کیا جارہا تھا۔ پھر پروگرام شروع ہوگیا۔ میں پوری توجہ سے گفتگو سننے لگا۔

پروگرام کے میزبان نے چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ایک بچے سے گفتگو شروع کی۔

"بیٹے آپ کا نام کیا ہے؟"

"جی.. محمد رمضان...." بچے نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" پھر سوال کیا گیا۔

"سیالکوٹ کے......"

"آپ کراچی کیسے پہنچے؟"

"وہاں جی....." بچہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"بتایئے ناں بیٹے...." میزبان نے پھر سوال

دہرایا۔

"..... سچی بات یہ ہے جی کہ ..... میری ماں کو میرے باپ نے طلاق دی تھی۔ میری ماں مجھے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ مگر باپ نے اجازت نہ دی۔ کچھ عرصہ کے بعد میرا باپ سعودی عرب چلا گیا اور مجھے تایا کے گھر چھوڑ گیا۔ تایا مجھے پڑھانے کے بجائے کام کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ میں وہاں ہوٹل پر کام کرتا تھا۔ تایا کی مار پیٹ سے تنگ آکر میں وہاں سے بذریعہ ٹرین یہاں کراچی بھاگ آیا.... یہاں آوارہ گھوم پھر رہا تھا کہ کسی نے پکڑ کر ایدھی سینٹر پہنچادیا۔" بچہ ان باتوں کے درمیان ہچکیاں لے کر رو بھی رہا تھا۔

"اگر آپ کے رشتہ دار آجائیں تو کیا آپ ان کے ساتھ جائیں گے؟"

"نہیں... نہیں.." بچہ تڑپ کر بولا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کیا۔ میرے سارے بدن میں لرزہ سا طاری ہوچکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ابھی جو گفتگو میں نے سُنی وہ میری ہی آواز تھی۔ میرا بچپن تھا۔ ایک بچے کی نہیں بلکہ ان ہزاروں مظلوم بچوں کی پکار تھی جو بڑوں کی غلطی سے اپنا ایک شاندار مستقبل کھو دیتے ہیں۔ میرے سامنے میں خود ہی ایک ثبوت کے طور پر موجود ہوں۔

میری بربادی کا آغاز میری ماں کے انتقال کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ ماں تھی تو میں بڑی بے فکری سے دنیا کی چلچلاتی دھوپ میں' ماں کی ممتا کے سائے میں پلتا رہا۔ ماں مرگئی تو باپ نے دوسری شادی کرلی اور مجھے یوں نظرانداز کیا جانے لگا جیسے دو فریقوں کے درمیان طے پانے والا معاہدہ ایک فریق کے ہٹتے ہی ردی کے کاغذ کی طرح پھینک دیا جائے۔ نئی ماں کی زیادتیاں حد سے بڑھیں تو میرا ذہن باغی ہوا اور پھر میں نے اپنا گھر' اپنا شہر چھوڑا اور حالات کے دھکے کھاتے کھاتے کراچی پہنچا۔ یہاں میں اجنبی ماحول میں حالات کے مطابق کبھی اِدھر کبھی اُدھر ڈولتا رہا۔ اخبارات بیچے' جوتے پالش کئے' ہوٹلوں میں مزدوری کی۔ یوں دس گیارہ سال کا بچہ اپنا بچپن بیچ کر جوان ہوا تب ایک روز ایک نیک دل سیٹھ نے مجھے اپنے ہاں ملازمت دے دی۔ وہ شہر میں دودھ سپلائی کیا کرتے تھے۔ میں ان کی ایک سوزوکی پک اپ پر کام کیا کرتا تھا۔ اپنی محنت اور ایمانداری کی بدولت پہلے ڈرائیور بنا اور پھر مزید ترقی ملی' انچارج بنا' تجربے اور طویل جدوجہد کے بعد میں نے اپنا کاروبار شروع کیا۔ اللہ کے فضل اور اپنی محنت کی بدولت آج میرا شمار اچھے کھاتے پیتے افراد میں ہوتا ہے۔ مگر میں آج تک اپنے بچپن کے حالات نہیں بھولا ہوں۔

آج بھی اگر کسی بچے کو قلم کے بجائے اینٹیں اُٹھاتے، برتن مانجھتے اور بوٹ پالش کرتے دیکھتا ہوں تو تڑپ اُٹھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ان کا مستقبل کیا ہے؟ اور یہ تڑپ اس بچے کی گفتگو سُننے کے بعد عروج پر پہنچتی ہے۔ میں نے بے اختیار ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھایا اور لرزتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف سے گھنٹی بجنے لگی۔ جلد ہی کسی نے ریسیور اُٹھایا،

"ہیلو ایدھی سینٹر....." دوسری طرف سے کسی مرد نے کہا۔

"دیکھئے جی... ابھی تھوڑی دیر پہلے ریڈیو پاکستان سے ایک گمشدہ بچے کی گفتگو نشر کی گئی ہے... کیا یہ بچہ اب بھی آپ کے پاس ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"جی ہاں جناب بچہ تو موجود ہے... کیا آپ اس کے وارث ہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"جی میں اس کا وارث تو نہیں.... مگر اس میں مجھے اپنے ماضی کی جھلک محسوس ہوئی تو...." میں اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"اوہ... آپ صبح آکر اس بچے سے مل سکتے ہیں....."

میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ وہ رات میں نے بڑی بے چینی میں گزار دی اور دوسری صبح سویرے میں ایدھی سینٹر پہنچا۔ جلد

ہی وہ بچہ میرے سامنے موجود تھا۔ چند لمحے میں اسے دیکھتا رہا پھر بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بار پھر بچہ بن گیا ہوں..... جسے ایک مضبوط سہارے کی تلاش ہے..... میں نے آفس والوں سے بات کی کہ میں اس بچہ کو لے جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہم چند دنوں اس کے وارثوں کا انتظار کریں گے اگر وہ نہیں آئے تو آپ ضروری کارروائی کے بعد اسے لے جاسکتے ہیں۔ اس بچے کے وارث مسلسل اعلانات کے باوجود اسے لینے نہ آئے اور ایدھی والوں نے اسے میرے حوالے کردیا۔ میرے بچوں اور بیوی نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس لئے کہ میں نے انہیں بتایا تھا کہ مظلوم کی مدد کرنے والے سے اللہ کتنا خوش ہوتا ہے ..... پھر جس دن، رمضان میرے بیٹوں، علی اور عامر کے ساتھ اسکول جانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے آج حقیقتاً" دوسرا جنم لیا ہے۔ اور کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟

تیسری کہانی

اور بچہ مل گیا

افتخار احمد

یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں نماز جمعہ جامع مسجد کوچۂ قاضی خانہ اندرونِ شہر لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ مسجد کے خطیب جناب پیر محمد سعید شاہ نازکی' کی طبیعت تھی جو ایک مجاہد آدمی ہیں۔

ایک صاحب تقریباً ہر جمعہ وہاں آتے۔ وہ بہت پریشان تھے ان کا آٹھ نو سال کا اکلوتا بچہ گم ہو چکا تھا، مولانا کے سامنے اپنی پریشانی بیان کرتے اور تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرتے۔ مولانا اسے تسلی دیتے اور اللہ سے دعا مانگنے کی نصیحت کرتے، وہ چلا جاتا۔ اگلے جمعہ کو معلوم ہوتا کہ اس کا بچہ ابھی تک نہیں ملا ہے۔

کئی ماہ کے بعد میں نے اسے دیکھا وہ بہت خوش تھا۔ اس کا بچہ مل چکا تھا۔ بچے کی بازیابی کی کہانی خاصی دلچسپ ہے۔ یہ کہانی اس وقت کے صدر پاکستان جنرل محمد ضیا الحق کی ذہانت اور ان

کی دُکھی عوام سے محبت و شفقت کی داستان بھی ہے۔

اس شخص کا آٹھ نو سال کا بچہ اس کے گھر کے قریب سے ہی کسی نے اغوا کرلیا تھا۔ وہ پولیس والوں کی منّتیں کرتا رہا۔ انہیں کھلاتا پلاتا رہا مگر پولیس مکمل بے حسی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ اکلوتے بیٹے کی گم شدگی نے والدین کی رات کی نیند اور دن کا چین حرام کردیا۔ وہ دن رات آنسو بہاتے اور مدد کے سہارے ڈھونڈتے۔ وہ سرکاری افسران کے پاس بھی گئے اور خانقاہوں پر بھی جاتے رہے مگر بچہ نہ ملا۔ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئے۔ دونوں میاں بیوی نے تہیّہ کرلیا کہ جب تک بچہ نہیں ملے گا وہ گھر پر نہیں سوئیں گے۔ وہ روزانہ شام ہوتے ہی شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کے مزار پر چلے جاتے۔ وہاں مسجد میں ساری رات عبادت کرتے اور اللہ کے حضور رو رو کر بچے کے لئے دُعا مانگتے اسی طرح ایک ماہ گذر گیا مگر بچے کا کوئی پتہ نہ چلا کہ وہ زندہ ہے یا مرچکا ہے۔

ایک رات کوئی ایک بجے کا وقت تھا کہ سیکورٹی والے مسجد میں داخل ہوئے اور ان افراد کو جو عبادت نہیں کررہے تھے وہاں سے ہٹانا اور باہر نکالنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص سفید کُرتہ شلوار اور سفید ٹوپی پہنے مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ حفاظتی گارڈ اور اعلیٰ پولیس افسران بھی تھے۔ دیکھنے والوں نے فوراً پہچان لیا یہ صدرِ پاکستان ہیں۔ صدر صاحب نے آتے ہی نوافل ادا کرنے شروع کردیئے۔ تقریباً پون گھنٹہ عبادت کرتے رہے۔ جس شخص کا بچہ گُم ہوا تھا وہ بھی اس وقت مسجد میں تھا۔ وہ بتاتا ہے:

"صدرِ پاکستان کو دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اپنی مُشکل ان سے بیان کروں۔ وہ ملک کے صدر ہیں۔ شاید میرا بچہ مجھ سے ملوادیں۔ پھر سوچا بھلا صدر صاحب مجھ غریب کی بات کیوں سُنیں گے اور سیکورٹی والے کیا مجھے قریب جانے دیں گے؟ بچے کی محبت مجھے بالکل پاگل کئے جارہی تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ صدر صاحب سے اپنا دُکھ لازماً" بیان کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اس کوشش میں پولیس والے پکڑلیں گے۔

پون گھنٹے بعد صدر صاحب عبادت سے فارغ ہوئے تو میں نے دور ہی سے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا۔ صدر صاحب نے سلام کا جواب دیا اور مجھے اپنے پاس بلایا۔ قریب گیا تو بولے " فرمایئے آپ کو کیا پریشانی ہے اور میں کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" میں نے سارا معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ میری داستان غم سُن کر ان کی

آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ مجھے تھپکی دے کر کہا "فکر نہ کریں اللہ بہتر کرے گا۔" پھر انہوں نے ساتھ آئے ہوئے پولیس افسران کو ہدایت کی کہ وہ میرے بچے کو ڈھونڈیں۔ صدر ضیا یہ کہہ کر چلے گئے۔ میں پولیس اسٹیشن کے چکر لگاتا رہا۔ مگر میری تمام کوششیں بے سود رہیں۔ پولیس والوں نے صدر ضیا کے حکم کو بھی کوئی اہمیت نہ دی۔

میں پہلے کی طرح ہر رات اس مسجد میں عبادت کے لئے جاتا رہا۔ تقریباً" دو ماہ بعد صدر ضیاء الحق دوبارہ تشریف لائے اور آتے ہی عبادت میں مشغول ہوگئے۔ میں کچھ دور کھڑا انتظار کرنے لگا کہ وہ فارغ ہوں تو ایک بار پھر ان کی خدمت میں گذارش کروں۔ وہ دُعا سے فارغ ہوئے اور انہوں نے بائیں جانب جدھر میں کھڑا تھا' دیکھا۔ ہاتھ کا اشارہ کرکے مجھے اپنی طرف بلایا اور پوچھا "لگتا ہے آپ کو آپ کا بیٹا نہیں ملا؟"

میں صدر ضیا الحق کی ذہانت اور چہرہ شناسی دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ کس طرح انہوں نے میرے چہرے سے میرے دُکھ کا اندازہ لگالیا تھا۔ پھر یہ کہ ان سے دو ماہ پہلے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے معاشرے میں تو برسوں کے شناسا بھی مصیبت کی گھڑی میں پہچاننے سے انکار کردیتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کے یہ صدر صاحب تھے جن سے روزانہ سینکڑوں لوگ ملتے تھے۔ بڑے بڑے سیاسی راہنما اور عُلما بھی لیکن پھر بھی انہوں نے مجھ غریب کو یاد رکھا تھا اور میرا مسئلہ بھی نہیں بھولے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص کوئی عام انسان نہیں بلکہ اللہ کا بہت ہی نیک بندہ ہے۔ ان کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ آپ کی ہدایات پر قطعاً" کوئی عمل نہیں ہوا۔ میں اور میری بیوی اب بھی اپنے بیٹے کی جُدائی میں رو رہے ہیں۔

میری بات ضیا صاحب خاموشی سے سُنتے رہے۔ میں سمجھا کہ اب وہ افسران کو بلا کر ڈانٹیں گے لیکن انہوں نے مُسکراتے ہوئے پاس بیٹھے ہوئے گورنر کی طرف دیکھا اور پولیس افسران اور چیف سیکریٹری کو ہدایت کی کہ "بچے کی برآمدگی کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔" انتظامیہ نے پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں تفتیش شروع کی اور چند پولیس افسران نے مجھے ڈانٹا کہ میں صدر کے سامنے ان کی شکایات کرتا ہوں۔

صدر ضیا کے بارے میں' میں نے سُنا تھا کہ وہ جب بھی لاہور آتے ہیں داتا دربار میں حاضری ضرور دیتے ہیں۔ صدر صاحب سے دوسری ملاقات کو تقریباً" تین ماہ گزر گئے اس دوران صدر صاحب ایک مرتبہ لاہور تو آئے مگر

داتا دربار حاضری نہ دی۔ مجھے بہت دکھ ہوا بعد میں پتہ چلا کہ کسی ملک کے سربراہ کے ساتھ لاہور آئے تھے اور اسی کے ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ اس واقعے کے چند دن بعد وہ دوبارہ لاہور آئے اور داتا دربار کی مسجد میں حاضری دی۔ اس بار بھی صدر صاحب نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ اور پوچھا "بچہ مِلا یا نہیں؟" میں نے ایک بار پھر اصل صورتِ حال سے انہیں آگاہ کیا۔ میں نے صدر صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ انہیں میری بات سُن کر بہت دُکھ ہوا ہے۔ انہوں نے ساتھ آئے ہوئے چیف سیکریٹری اور پولیس افسران سے کہا "اب تک بچہ مل جانا چاہیئے تھا۔ بہت ہو چکی اب مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔ بچے کو فوراً تلاش کیا جائے اور مجھے اس کی رپورٹ کرو۔"

اب کے صدر صاحب کا انداز غصّہ لئے ہوئے تھا۔ پولیس افسران سمجھ گئے تھے کہ اگر اس بار سستی کی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔

تھانے والے مجھے اپنی جیپ میں بٹھا کر آئی جی صاحب کے پاس لے گئے۔ آئی جی صاحب نے ساری معلومات مجھ سے حاصل کیں اور کارروائی کے احکامات جاری کردیئے پھر اتنی تیزی سے کام ہوا کہ تیسرے دن مجھے میرا بچہ مل گیا۔

آنکھ مچولی

آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔
ہماری کاوش آپ تک اور
آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے مُعاون

ہمارے مَددگار

صُوبہ سندھ اور بلوچستان میں آنکھ مچولی کے ایجنٹ

محمد حسین برادرز — کراچی — ۷۷۲۴۱۲۶
مہران نیوز ایجنسی — حیدرآباد — ۳۰۱۲۸
سلمان برادرز — نواب شاہ — ۲۴۱۴
ایم ایم ٹریڈرز — کوئٹہ — ۷۸۰۰۲

خط و کتابت کے لیے

سرکولیشن مینیجر

ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

ORIENT/McCANN

بچوں کی حفاظت

حفیظ الرحمٰن

ہم میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو کسی بچے کو تکلیف دینے یا اسے نقصان پہنچانے کا خیال بھی اپنے دل میں لانا پسند نہیں کرتے۔ کجا کہ یہ بچہ ان کا اپنا ہو۔ لیکن بدقسمتی سے آج کل ایسا ہو رہا ہے۔

جیسے ہم اپنے بچوں کو آگ سے بچنے اور مصروف شاہراہوں پر ٹریفک سے محفوظ رہنے کے بارے میں سکھاتے اور بتاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ہم انہیں انسانوں سے پہنچنے والے خطرات کی امکانی صورتوں کے بارے میں بھی بتائیں۔ جب ہم اپنے بچوں کو لوگوں سے محفوظ رہنے کے بارے میں سکھاتے ہیں تو ہم میں سے اکثر لوگ بڑے غیر واضح اور مبہم انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں بچوں کو سمجھانے کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ ہم بڑے پُراسرار انداز میں انہیں

بتاتے ہیں کہ " بیٹے کسی اجنبی سے ٹافی نہیں لیتے" "انجان لوگوں سے باتیں نہیں کرتے" "کسی کی کار یا موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھتے" یا یہ کہ فلاں بچی کو کوئی پکڑ کر لے گیا تھا۔ وغیرہ"

بچے پھول ہیں' خوشبو ہیں' ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی پھول کو مسل دینے اور ان کی شخصیت کو کچل دینے کے مترادف ہے۔ بچوں کو سچ بولنا آتا ہے وہ بڑوں کی طرح جھوٹ کم ہی بولتے ہیں۔ جن بچوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی عمر سے ہو۔

امریکہ میں بچوں پر بے توجہی اور بُرائیوں کے انسداد کی قومی انجمن کی صدر میری سنکلیئر کہتی ہیں۔

"بچوں میں اتنی اخلاقی جرأت پیدا کیجئے کہ جو چیز انہیں پریشان کرے وہ اس کے بارے میں اعتماد سے کہہ سکیں۔ انہیں یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے کہ کوئی شے بھی ایسی شجرِ ممنوعہ نہیں ہوتی کہ جس کے بارے میں بات نہ کی جاسکے۔"

دل کی بات کہنے میں بچّوں کی مدد کیجئے۔

ہیلم میک آدم ایک ایسی تنظیم کی پروگرام کوآرڈینیٹر ہیں جو بچوں کو بے راہ روی سے بچانے کے سلسلے میں بچوں اور ان کے والدین کی مدد کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں'

"درحقیقت یہ بہت اہم ہے کہ آپ نہ صرف اس بات پر غور کریں کہ بچہ براہِ راست کیا کہہ رہا ہے بلکہ اس بات پر بھی کہ بین السطور وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔" مثال کے طور پر جب بچہ اس طرح کی کوئی بات کہتا ہے کہ فلاں کے گھر ٹیوشن یا سپارہ پڑھنے نہیں جائے گا۔ تو اس کے باوجود کہ وہ اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کرسکتا' لیکن یہ اس بات کا ایک اشارہ ضرور ہوسکتا ہے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے اور خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ جس میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین کے خیال میں والدین کی اس موضوع پر تعلیم و تربیت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ عام علمی موضوعات پر۔ تاہم اساتذہ اور دادا دادی یا نانا نانی وغیرہ کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ایسی باتوں پر گہری نظر رکھیں جو بچوں کے بگڑنے کے امکانات ظاہر کرتی ہوں۔

ہیلن میک آدم' جنھوں نے نیو ساؤتھ ویلز میں بہت سے اسکولوں میں پپٹ شو کے ذریعے بچوں کو بُرائیوں سے بچنے کی انسدادی تدابیر سکھائیں۔ اس بات پر گہرا یقین رکھتی ہیں کہ اگر والدین کی مدد سے اسکولوں میں ایک ایسا پروگرام

نصاب تعلیم کے طور پر شروع کیا جائے جس کے تحت بچوں کو اپنی حفاظت آپ کرنے کی باقاعدہ تعلیم دی جائے تو یہ بُرائیوں کے خلاف ایک مؤثر ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔

جنس جیسے نازک موضوع پر آپ کس طرح اپنے بچّوں سے گفتگو کر سکتے ہیں؟

روز میری سنکلیئر کے مطابق، بچوں سے اس موضوع پر بات کرنے کے لئے کوئی وقت بھی مناسب وقت نہیں ہوتا۔ البتہ آپ ان اشارات سے متعلق آگاہی ضرور حاصل کر سکتے ہیں جن کی مدد سے آپ جان سکیں کہ کب آپ کا بچہ آپ سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ آپ کے دل میں یہ پریشان کن خیال پیدا ہو کہ ان خطرات کے بارے میں بات چیت کرنے سے آپ کا بچہ خوف اور عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن یقین رکھئے کہ اجنبی لوگوں کے بارے میں کی جانے والی مروّجہ پُر اسرار گفتگو ان سے کہیں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ آپ تو بس اسے چند بُنیادی اُصول سمجھا دیں جن پر وہ عمل کر سکے اور یقین ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اعتماد کے ساتھ ان اصولوں پر عمل کرے گا۔

اپنے بچّوں میں اعتماد پیدا کیجئے!

بچے فطری طور پر مسرّت پسند اور تعریف پسند ہوتے ہیں۔ اور پھر ہم خود بھی انہیں بڑوں کی عزّت کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات سمجھنے میں ان کی مدد کرنی چاہئے کہ کسی بھی شخص کو، خواہ وہ اسے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ انہیں ایسا کام کرنے پر مجبور کرے یا انہیں اس انداز میں چھوئے جو انہیں پریشانی اور اُلجھن میں مبتلا کر دے یا جسے پوشیدہ رکھنا بچے کے لئے ضروری ہو جائے۔ بچوں میں معاملے کو خود پرکھنے کی اہلیت اور ناپسندیدہ بات پر انکار کی جرأت پیدا کیجئے۔ بلاشبہ اپنے تحفّظ کی تمام تر ذمّہ داری کی بچوں سے اُمید نہیں رکھی جا سکتی لیکن یہ سوچنے اور سیکھنے میں مدد دیتے ہوئے کہ کس موقع پر انہیں کیا روّیہ اختیار کرنا چاہئے، ہم انہیں خطرات سے بچاؤ کے بہترین مواقع فراہم کر سکتے ہیں۔

بچّوں کے لئے راہ نما خطوط

بچوں کو بتایئے کہ.....

- اگر کوئی آپ کو اس انداز میں چھُونے یا پیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، جسے آپ پسند نہیں

کرتے تو بلا خوف و خطر بلند آواز سے "نہیں" کہہ دیں۔

○ یاد رکھئے آپ کا جسم آپ کی ملکیت ہے۔ اگر کوئی آپ کے جسم کو اور خاص طور پر پوشیدہ حصّوں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے تو سختی سے منع کردیجئے اور جتنی جلدی ممکن ہو اس حرکت کے بارے میں کسی بااعتماد فرد کو بتادیجئے۔ کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہئے کہ وہ آپ کو پریشانی یا عدم تحفّظ کے احساس میں مبتلا کردے۔

○ راہ چلتے لوگوں سے بے تکلف گفتگو مت شروع کردیجئے۔ اگر کوئی اجنبی شخص آپ سے زبردستی بات کرنا چاہے تو قطعاً" اس کی باتوں پر دھیان نہ دیں اور اپنی راہ چلتے رہیں۔ یوں ظاہر کریں جیسے آپ نے اس کی بات سُنی ہی نہیں۔

○ اگر امی اندر کسی کمرے میں کسی کام میں مصروف ہیں تو دروازے پر آنے والے کسی بھی اجنبی شخص کو خود ہی جواب دینے مت چلے جائیے۔ امی کو بتائیے اور ان کی موجودگی میں بات کیجئے۔

○ والدین کے علم میں لائے بغیر کسی بھی شخص سے پیسے، ٹافیاں یا کوئی بھی تحفہ وصول نہ کیجئے۔

○ کسی ایسے شخص کے ساتھ ہرگز نہ جائیے جو اسکول سے آپ کو یہ کہہ کر لینے آیا ہو کہ اسے آپ کی امی یا ابو نے بھیجا ہے۔ اگر آپ اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہیں تو ٹھیک ہے یا اگر وہ ہے تو اجنبی لیکن آپ کے گھر کے (ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے بنائے گئے) خفیہ اشارے جانتا ہے تو اس کے ساتھ جانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

والدین کے لئے راہ نما خطوط

چند کام کی باتیں.....

○ اپنے بچوں کو سکھائیے کہ انہیں کب، کہاں، کیسے اور کیوں "نہیں" کہنا چاہئے۔

○ توجّہ سے اپنے بچوں کی بات سنئے۔ خاص طور پر جب وہ تعلیمی ادارے، بڑے بچوں اور نوعمروں کے بارے میں کہہ رہے ہوں۔

○ انہیں اچھے دوست بنانے کی ترغیب دیجئے۔

○ ہمیشہ اپنے بچوں کی بات کا اعتبار کیجئے۔

○ اپنے بچوں سے خوب پیار کیجئے تاکہ ان میں صحیح اور غلط انداز محبت میں فرق کرنے کی اہلیت پیدا ہوسکے۔

فرض کیجئے !

"فرض کیجئے" کے عنوان سے ایک کھیل بنائیے جس میں آپ بچوں میں ہلکے پھلکے سوالات

کے ذریعے مختلف حالات میں معاملات کو سمجھنے، پرکھنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا کرسکتے ہیں۔ یہ طریقہ بہت زیادہ مؤثر اور سُود مند ثابت ہوسکتا ہے۔ شروع میں آپ ان سے ذاتی تحفظ کے عام نوعیت کے سوالات پوچھئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے حالات اور موضوعات کے بارے میں سوچنے کے مواقع فراہم کیجئے۔ مثال کے طور پر شروع میں ان سے پوچھیے،

"فرض کیجئے کہ کوئی شخص آپ کے پاس اسکول میں آتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے آپ کی امی نے آپ کو لینے کے لئے بھیجا ہے تو آپ کیا کریں گے۔" یا یہ کہ "فرض کیجئے کوئی ایسا شخص جسے آپ اچھی طرح جانتے ہیں، آپ سے اس انداز میں لاڈ کرتا ہے جسے آپ پسند نہیں کرتے تو آپ کیا کریں گے؟"

عام طور پر بہت سے بچے کسی گڑبڑ کو ظاہر نہیں کرتے۔ وہ مہینوں اور بعض اوقات سالوں تک اسے راز سمجھ کر دبائے رکھتے ہیں اور کسی بھی شخص کو بتاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ بچوں کو اس بات کا شعور ہو کہ کب کونسی بات چُھپانا ضروری اور بہتر ہے اور کب اس کا اظہار کردینا اچھا ہے۔ اس مقصد کے لئے بھی آپ وہی "فرض کیجئے" والا کھیل استعمال کرسکتے ہیں۔ مثلاً آپ پوچھیں "فرض کیجئے آپ کے بھائی جان آپ سے کہتے ہیں کہ امی کی اس ساڑھی کے بارے میں کسی کو کچھ مت بتایئے گا جو وہ انہیں خاص سالگرہ کے تحفے میں دینا چاہتے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟" بچوں کو یہ بھی بتایئے کہ کسی ایسی بات کا چُھپا لینا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ تب آپ ان سے ایک سوال اور کریں۔

"فرض کیجئے کوئی آپ سے ایسی بات کو راز میں رکھنے کے لئے کہتا ہے جسے آپ بُرا سمجھتے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟" اس موقع پر بچوں کو بتایئے کہ ایسی باتوں کو چُھپانا ٹھیک نہیں ہے۔ فوراً کسی بڑے کو بتادینا چاہئے۔

ایک مسئلہ اچھے اور برے لوگوں کی پہچان کا بھی ہوتا ہے۔ بچوں کو بتایئے کہ صرف وہی لوگ بُرے نہیں ہوتے جن کو وہ ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں بُرے کردار کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ بلکہ دراصل بُرے لوگ وہ ہوتے ہیں جو بُری باتیں کرتے ہیں چاہے دیکھنے میں وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ لگتے ہوں۔ یہاں بھی آپ "فرض کیجئے" والے کھیل سے مدد لے سکتے ہیں۔ اور بچوں کو (خاص طور پر بچیوں) سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کن افراد کو اپنے لئے محفوظ اور محافظ سمجھتے ہیں۔

"فرض کیجئے کوئی آپ کو اس انداز میں چھونا چاہتا ہے جسے آپ پسند نہیں کرتے تو آپ کیا کریں گے اور کس کو اپنی مدد کے لئے اس حرکت کے بارے میں بتائیں گے۔ کسی پولیس افسر کو' اپنی بڑی بہن کو' کسی بڑی عورت کو' استانی یا دادی جان کو؟"

جب آپ اس مضمون کو غور سے پڑھ لیں اور اچھی طرح سمجھ لیں تو اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھئے اور مندرجہ ذیل نکات پر کام کرتے ہوئے انہیں اچھے اور برے کی تمیز اور ذاتی تحفظ کی تعلیم دیں۔

اپنے جسم کا خاکہ بنائیے!

آپ کا پورا جسم آپ کی ملکیت ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کے جسم کو اس انداز میں چھونا چاہتا ہے جس سے کہ آپ پریشانی یا خوف میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو اسے سختی سے منع کردیجئے اور فوراً" کسی ایسے شخص کو بتایئے جس پر آپ اعتماد کرتے ہوں۔

☆ اپنے جسم کا خاکہ بنایئے اور جن حصوں کا چھوا جانا آپ پسند کرتے ہیں۔ ان میں سبز اور جن کا چھوا جانا پسند نہیں کرتے ان میں سرخ رنگ بھریئے۔

چیزیں مت لیجئے.....

کسی بڑے کے علم میں لائے بغیر کسی سے بھی پیسے' ٹافیاں یا کوئی اور تحفہ ہرگز قبول نہ کیجئے۔ کچھ لوگ بچوں کو ورغلانے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اس کو آپ رشوت کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اس شخص کی مرضی کے مطابق کام کرنے پر آمادہ ہوسکتے ہیں یا کم از کم اس شخص کے بارے میں آپ اُلجھن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کبھی بھی رشوت مت لیجئے۔

☆ ایک تصویر بنایئے جس میں دکھایئے کہ ایک ہاتھ آپ کو کوئی چیز دے رہا ہے اور آپ انکار کررہے ہیں۔

کون آپ سے لاڈ کرسکتا ہے؟

لاڈ اور پیار بہت اچھی بات ہے خاص طور پر ایسے لوگوں کا لاڈ جن کے لئے ہم خود چاہتے ہوں کہ وہ ہمیں پیار کریں۔ اس کو کبھی بھی خفیہ نہیں رکھنا چاہئے۔ آپ کو کس کا لاڈ اچھا لگتا ہے؟ امی کا' ابو کا' یا دادی یا نانی جان کا اور کن لوگوں کے پیار کرنے سے آپ چڑتے ہیں۔

☆ ایک کاغذ اور رنگین قلم لیجئے اور مختلف خانے بنایئے۔ ایک میں ایسے لوگوں کے نام لکھئے جن کا پیار کرنا آپ کو اچھا لگتا ہے اور

دوسرے خانے میں ان لوگوں کے نام جن کا لاڈ کرنا آپ کو اچھا نہیں لگتا۔

کوڈ ورڈز بنائیے!

کوئی ایسا نام یا اشارہ مقرر کیجئے جسے آپ کے اور آپ کے گھر والوں کے علاوہ کوئی نہ جانتا ہو تاکہ اگر کبھی آپ کے والدین آپ کو اسکول سے یا کسی اور جگہ سے خود لینے نہ آسکیں اور انہیں کسی دوسرے آدمی کو بھیجنا پڑے تو وہ خُفیہ نام یا اشارہ اس شخص کو بتادیں۔ آپ کو بھی چاہئے کہ اس خُفیہ نام یا اشارے کے بتائے بغیر کسی شخص کے ساتھ نہ جائیں۔

☆ کوڈ ورڈز کو ہمیشہ خُفیہ رکھئے۔ دوستوں کو مت بتاتے پھریئے۔ اسے کسی محفوظ جگہ پر نوٹ کرلیجئے اور زبانی بھی یاد رکھئے۔

بھاگ جایئے!

اگر کبھی کوئی اجنبی شخص یا وہ شخص جسے آپ پہلے سے جانتے ہوں۔ آپ کو ضرر پہنچانا چاہے یا ایسے انداز میں آپ کو چھُونا چاہے جو آپ کو خوف یا پریشانی میں مبتلا کردے تو فوراً وہاں سے بھاگ جایئے اور جتنی جلدی ممکن ہوسکے کسی کی مدد حاصل کیجئے۔

☆ آپ کے خیال میں وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں کہ جن سے کبھی ضرورت پڑنے پر مدد حاصل کرسکتے ہیں۔ ان کے ناموں کی فہرست بنائیے۔

کیا بات خُفیہ رکھنی چاہیئے اور کیا نہیں!!

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو چھپا لینا کوئی بری بات نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی مذاق کے طور پر، کسی کو حیران کرنے کے لئے اپنی سالگرہ کی تقریب کو خفیہ رکھتا ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں لیکن اگر کوئی شخص آپ سے لاڈ پیار کرتا ہے اور کہتا ہے "کسی کو بتانا مت" تو سمجھیں کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ آپ فوراً ایسے شخص کے بارے میں کسی بااعتماد فرد کو بتادیجئے۔

☆ کسی ایسی بات یا شے کی تصویر بنایئے جس کو خفیہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مت چھپایئے!

اگر کسی شخص کا رویّہ آپ کو خوف یا عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کرتا ہے تو اس کے بارے میں کچھ مت چھُپایئے کیونکہ اس میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں ہے ناں! فوراً کسی بااعتماد فرد کو بتایئے۔

اگر وہ شخص جسے آپ نے اپنے خدشات سے آگاہ کیا ہے۔ آپ کی بات کا یقین نہیں کرتا

تو کسی اور کو اس بارے میں بتائیے اور اس وقت تک کوشش کرتے رہیے جب تک کہ کوئی آپ کی بات پر یقین نہیں کرلیتا۔

☆ ایسے پانچ افراد کے نام لکھئے جن کو آپ یہ باتیں بتاسکتے ہیں۔

اِنکار کردیجئے!

اگر کوئی بڑا آدمی جسے آپ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں آپ کی پسند اور مرضی کے خلاف آپ سے پیار کرے' یا جس کا رویہ آپ کو الجھن میں مبتلا کردے یا وہ آپ کو اس راز کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کو کہے تو اسے سختی سے منع کردیجئے۔

☆ اپنے پسندیدہ رنگوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنی تصویر بنائیے جس میں آپ کسی بات سے انکار کررہے ہوں۔

بُلند آواز میں چیخئے!

آپ جہاں کہیں بھی ہوں۔ اگر کوئی فرد آپ کو نقصان پہنچانا چاہے یا کوئی چیز آپ کو خطرے یا تکلیف کا احساس دلائے تو فوراً" بلند آواز میں چیخئے۔ اونچی سے اونچی آواز میں چیخنے کی مشق کرتے رہیے۔

☆ اپنی تصویر بنائیے جس میں آپ بہت زور سے چیخ رہے ہیں۔

آپ کے خیال میں.....

آپ خیال میں آپ کے ذاتی تحفظ کے کیا کیا طریقے ہوسکتے ہیں۔ ایک صاف کاغذ پر تفصیل سے لکھئے۔

ایکشن پلان

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بچوں کا تحفظ آپ کی روز مرہ کی ضرورت بن چکا ہے۔ اخبارات روزانہ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی بھی جگہ اور کوئی بھی شخص محفوظ نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ نہ تو بچے کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ہر وقت' ہر جگہ انہیں تحفظ فراہم کرسکتے ہیں۔ مگر معاملے کا شعور آپ کو بچے کے تحفظ کے بارے میں بہت سے وہموں سے بچنے میں مدد دے سکتا ہے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ بچپن ہی سے ذاتی تحفظ کے نظریئے کو سامنے رکھتے ہوئے بچے کی تعلیم و تربیت کیجئے۔ آپ کی سہولت کے لئے ہم ذیل میں مختلف عمروں کے بچوں کی تربیت اور تحفظ سے متعلق چند اشارات درج کررہے ہیں۔

ایک سال تک کی عمر کے بچّوں کے لئے

○ بچے کی محفوظ ترین جائے پناہ آپ کی

اپنی گود ہے۔ شاپنگ کے دوران بچے کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھئے چاہے آپ کو صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ہی کیوں نہ خریدنا ہو یا بچہ آپ کے لئے وقتی پریشانی کا باعث بن سکتا ہو۔ یاد رکھیئے آپ کی یہ وقتی پریشانی ان برے نتائج سے بہت کم ہے جو بچے کو شاپنگ کے دوران تنہا چھوڑنے کی صورت میں ظاہر ہوسکتے ہیں۔

○ بازار میں دکانوں کے اونچے دروازوں' سیڑھیوں اور مصروف راہداریوں میں بچہ گاڑی کھینچنے کی مشقت سے بہتر ہے کہ آپ بچے کو گود میں اٹھائیں۔

○ اپنی عادت بنالیجئے کہ آپ بچے کو کبھی بھی کار میں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

ایک سے پانچ سال تک بچّوں کے لئے

☆ جب بچہ پاؤں پاؤں چلنا سیکھ جاتا ہے تو تیزی سے اِدھر اُدھر کھسکنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے میں اسے سنبھالنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

☆ جب آپ بازار جائیں تو انہیں بچہ گاڑی میں ہرگز نہ چھوڑیں بلکہ اگر آپ کو کچھ زیادہ شاپنگ نہیں کرنی تو بچوں کو گود میں اُٹھائے رکھیں۔

☆ ممکن ہو تو کسی سہیلی یا ساتھی کو ساتھ لے لیں جو شاپنگ کے دوران آپ کے بچے کی دیکھ بھال کرسکے۔

☆ باغوں میں یا تفریح گاہوں میں جاتے ہوئے بالکل چوکنا رہئے۔ خصوصاً" دروازوں پر جہاں زیادہ بھیڑ ہوتی ہے بچوں کا ہاتھ تھام لیجئے اور سیر کے دوران بھی اس بات کو یاد رکھئے کہ یہ کوئی بالکل محفوظ جگہ نہیں ہے۔

☆ اگر نانی یا دادی یا کوئی آنٹی آپ کے بچے کو ٹہلانے کے لئے باہر لے جانا چاہتی ہوں تو انہیں پہلے سے آگاہ کردیجئے کہ بچہ کس تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگ سکتا ہے۔

☆ کسی قدر بڑے بچے سے ہرگز یہ امید نہ رکھیں کہ وہ ننھے بچوں کی حفاظت کی مکمل ذمّہ داری ادا کرسکتا ہے۔

☆ ایسے بچوں کو کار میں تنہا مت چھوڑیئے۔

پانچ سال سے بڑے بچّوں کے لئے

○ خود اعتمادی اور خود انحصاری اچھی چیزیں ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی ہونی چاہئے لیکن اپنے بچے کو بتایئے کہ بعض معاملات میں اسے بڑوں کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور اسے ان سے ضرور مدد لینی چاہئے۔

○ بچوں' خاص طور پر بچیوں کے ساتھ "فرضی کیجئے" والا کھیل کھیلتے ہوئے ان کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو

پروان چڑھائیے۔

○ بچوں کو چھٹی کے بعد اسکول سے لانے کے لئے بروقت اسکول پہنچئے۔ کبھی امکانی تاخیر کے پیش نظر کوئی ایسی محفوظ جگہ مخصوص کرلیجئے جہاں بچہ آپ کا انتظار کرسکتا ہو۔

○ گھر کے دروازوں میں اتنی بلندی پر کنڈی لگائیے جہاں بچوں کا ہاتھ آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔

○ اپنے بچوں کے دوستوں کے بارے میں پوری پوری معلومات رکھئے۔ انہیں اچھے دوست بنانے کی ترغیب دیجئے اور کھیل کے دوران ان پر گہری نظر رکھئے۔

روانڈا کی اس ماں کا جوان بیٹا اور شوہر خانہ جنگی میں مارے گئے۔ مظلوم بچے کی بدنصیب ماں اپنے اکلوتے بچ جانے والے بچے کو سینے سے لپٹائے زار و قطار رو رہی ہے!!

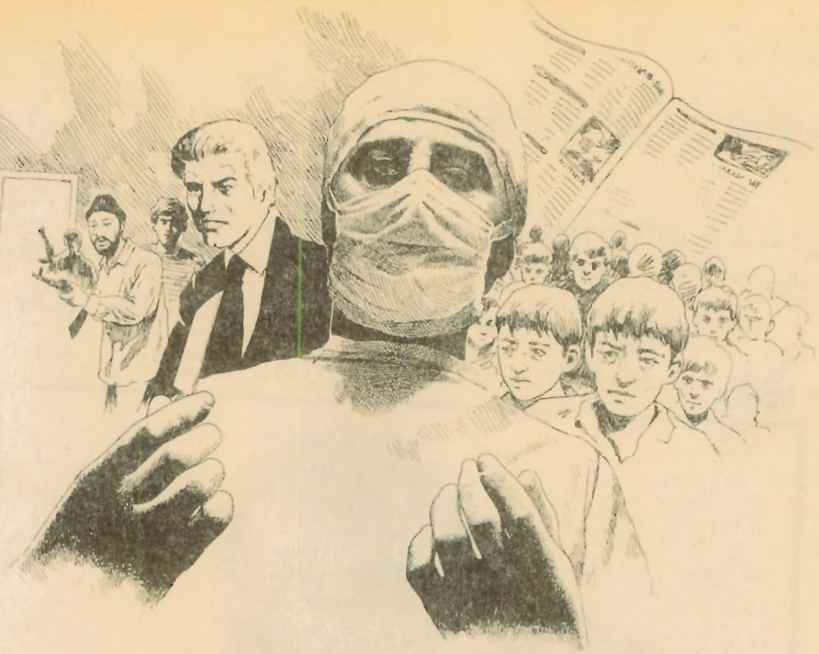

آپریشن ڈاکٹر نے کیا تھا

شبانہ رشید

ڈاکٹر سلمان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ان کی کرسی کے پیچھے کھڑے دو مسلح افراد نگرانی پر معمور تھے ابھی چند گھنٹے قبل ہی انہیں اس کمرے میں لایا گیا تھا جو مدھم روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مدھم روشنی ہونے کے باوجود کمرے کا منظر نمایاں تھا اور دونوں مسلح افراد بہت چاک و چوبند دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی نظریں بیک وقت ڈاکٹر اور دروازے دونوں پر تھیں اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور ایک مسلح شخص نے پھرتی سے آگے بڑھ کر فون اُٹھالیا۔ چند منٹ کی ہدایت سُننے کے بعد اس نے فون رکھا اور ڈاکٹر سلمان کی آنکھوں کی پٹی کھولنے لگا۔ پٹی کھلنے کے بعد ڈاکٹر سلمان نے حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا ان کے چہرے پر پریشانی اور خوف کے اثرات بدستور موجود تھے۔ وہ حالات کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر تھے ان کا خیال تھا

کہ انہیں اغوا برائے تاوان کے مقصد کے لئے اغوا کیا گیا ہے۔

شام چھ بجے جب وہ اپنے کلینک سے گھر جانے کے لئے نکلے تھے تو یہ واقعہ پیش آیا تھا اور وہ مکمل طور پر دو مسلح افراد کی دسترس میں تھے۔

آنکھوں سے پٹی کھولنے کے بعد ان سے کوئی بات وغیرہ نہ کی گئی۔ ابھی ڈاکٹر سلمان آنے والے حالات کے بارے میں خود کو ذہنی طور پر تیار کر ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم پست قامت شخص اندر داخل ہوا۔ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ اور اس کی چال میں شانِ بے نیازی نمایاں تھی "ہیلو ڈاکٹر کیسے ہو؟" آنے والے شخص نے بڑی اپنائیت سے پوچھا ڈاکٹر سلمان کے ماتھے پر سلوٹیں نمایاں ہو گئیں انہوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولے "تم لوگ مجھے یہاں کس مقصد کے لئے لائے ہو؟"

"مقصد تو بڑا نیک ہے ڈاکٹر بشرطیکہ کے تم اسے پورا کردو۔" وہ شخص پھر اسی انداز سے مخاطب ہوا "تمہیں روپے چاہئیں ہیں نا۔ اغوا کر کے تاوان وصول کرنا چاہتے ہو" ڈاکٹر سلمان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی آواز میں غصّہ نمایاں تھا۔

"نہیں ڈاکٹر ہم ایسے چھوٹے چھوٹے کام نہیں کرتے اصل میں تمہیں....." وہ کہتے کہتے رُک گیا اور دونوں افراد کو باہر جانے کا اشارہ کرنے لگا۔ اشارہ پاکر وہ بڑی پھرتی سے باہر نکل گئے "ڈاکٹر تمہیں یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ تمہیں آپریشن کرنے ہیں۔"

"آپریشن کرنے ہیں۔" ڈاکٹر سلمان خود سے بڑبڑائے "لیکن آپریشن کروانے کا یہ کونسا طریقہ ہے؟" "دیکھو ڈاکٹر تم ہماری بات غور سے سُنو کیوں کہ تمہیں اس پر عمل کرنا ہے بس چند بچوں کے آپریشن کرنے ہیں۔" "مگر ان بچوں کو کیا ہوا ہے؟" ڈاکٹر سلمان نے پوچھا "انہیں تو کچھ نہیں ہوا البتہ تمہیں آپریشن سے ان کا ایک ایک گُردہ نکالنا ہے تمہارے لئے یہ تو کام بہت آسان ہوگا۔" اس شخص کی آخری بات نے ڈاکٹر سلمان کو شک میں مبتلا کردیا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور یہ کس کے بچے ہیں؟" "ڈاکٹر صاحب بچے تو اپنے ہی ہیں بس اِدھر اُدھر سے اُٹھالیتے ہیں اور اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ آپ سمجھ تو چکے ہوں گے ہم کیا کاروبار کرتے ہیں" وہ شخص ڈھٹائی سے قہقہہ مار کر بولا "شکر کرو ڈاکٹر ہم ان کا صرف ایک ہی گُردہ نکالتے ہیں انہیں جینے کا حق تو دیتے ہیں تمہاری دُنیا میں تو انہیں یہ حق میسّر ہی نہیں ہے۔"

"میں اگر یہ کام نہ کروں تو؟" ڈاکٹر سلمان

کی بات سُن کر اس شخص نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "کام تو کرنا ہی پڑے گا ڈاکٹر..... ورنہ تو آپ جانتے ہیں۔ ہم دن دھاڑے آپ جیسوں کو اُٹھوالیتے ہیں تو بچوں کو اُٹھانا کیا مشکل کام ہے وہ بھی آپ کے پیارے پیارے بچوں کو۔" وہ پست قامت شخص بڑی ڈھٹائی سے ہنسا اس کی ہنسی ڈاکٹر سلمان کی رگوں میں خون کی گردش تیز کرگئی۔ اور وہ سوچ میں پڑگئے۔

وہ آدمی ایک بار پھر قہقہہ لگا کر ہنسا "آپ بڑے بھولے ہیں ڈاکٹر صاحب ہم اتنے عرصے سے یہ کاروبار کررہے ہیں ہمارے لئے جو کام کررہے ہیں وہ بھی ڈاکٹرز ہی ہیں ہم انہیں اس کام کا معقول معاوضہ دیتے ہیں۔" "تو پھر یہ کام بھی آپ انہی سے کروالیں اور مجھے جانے دیں۔"

"وہ یہاں ہوتے تو انہی سے کرواتے وہ ہمارے ہی کام سے کہیں گئے ہیں۔" اس شخص نے اطلاع دی ڈاکٹر سلمان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ انہیں کس طرح سمجھائیں۔ اب انہیں یقین ہوچلا تھا کہ یہ لوگ کام کروائے بغیر انہیں چھوڑنے پر ہرگز راضی نہ ہوں گے لیکن وہ کس طرح سے یہ ظلم کرسکتے تھے۔ ان کا کام تو مریضوں کو شفا بخشنا تھا۔ "کچھ بھی ہوجائے میں یہ ظلم و زیادتی ان معصوم بچوں پر ہرگز نہ کروں گا۔" ڈاکٹر سلمان پھر اپنے موقف پر ڈٹ گئے "تو تم شرافت کی زبان نہیں سمجھو گے۔" وہ آگے بڑھا ڈاکٹر کو کرسی پر دھکا دے کر ان کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑتے ہوئے خوں خوار انداز میں چلایا "کام تو ہمارا ہر حال میں ہوجائے گا تم انکار کرو یا اقرار لیکن انکار کی صورت میں تمہاری لاش تمہارے وارثوں کو کسی گندے نالے میں پڑی ملے گی۔" "میں تمہاری بات ہرگز نہ مانوں گا۔ کچھ نہیں ..... کروں گا۔" ڈاکٹر سلمان جذباتی انداز میں چلّائے۔

"نہیں کرو گے؟؟" وہ آدمی دھاڑا اور ایک زناٹے دار تھپّڑ ڈاکٹر سلمان کے چہرے کو سرخ کرگیا "تمہیں اپنی تو فکر نہیں لیکن اپنے بچوں کی تو ہوگی ہم نوجوانوں کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں۔ تمہارے بچوں کو بھی یہاں لاکر ان کے جسموں سے خون کی آخری بوند تک نکال لیں گے اور ان کے گُردے ....."

ڈاکٹر سلمان کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا "الٰہی اتنا بڑا ظلم" وہ جو کچھ کہہ رہا تھا ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اس پر عمل بھی کر دکھائیں فہد، کرن اور عدیل کی پیاری، معصوم صورتیں، ان کی نگاہوں میں گھوم گئیں وہ سب آپس میں کتنا پیار کرتے ہیں۔ ایک ہی لمحے میں ڈاکٹر سلمان

شکست خوردہ نظر آنے لگے ایک جملے نے ان کی ساری توانائی ان سے چھین لی تھی ڈاکٹر سلمان کے چہرے پر سوچ کی لکیریں گہری ہونے لگیں انہوں نے اپنی نظریں اُٹھائیں اور شکست خوردہ انداز میں بولے "میں تیار ہوں" جب انہیں اس کمرے میں لایا گیا جہاں سات آٹھ بچے جمع تھے جن کا انہیں آپریشن کرنا تھا۔ اس کمرے میں آپریشن کا تمام جدید سامان موجود تھا۔ اور مدد کے لئے ایک کمپاؤنڈر بھی۔ ان بچوں کی طرف بڑھنے سے پہلے ڈاکٹر کا ہاتھ کپکپایا ان کے زندہ و بیدار ضمیر نے انہیں جھنجھوڑا پھر وہ بے بسی کی صورت آپریشن ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔

دوسری صبح بہ خیریت انہیں ان کے گھر پہنچا دیا گیا لیکن ندامت کے آنسو ڈاکٹر سلمان کے چہرے کو تر کر گئے تھے۔ بیوی اور بچے حیران و پریشان کہ انہیں کیا ہو گیا ہے؟ شاید اسپتال میں مریض کی موت نے انہیں مضطرب کر دیا ہو؟ بیگم سلمان نے سوچا۔ پوچھنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی ڈاکٹر سلمان دو دن تک کلینک نہ جا سکے وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہے تھے تیسرے دن ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتے ہوئے ان کی نظر ایک خبر پر جم کر رہ گئی "بچوں کو اغوا کر کے ان کے گردے نکال کر فروخت کرنے والے گروہ کو گرفتار کر لیا گیا انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کئی بااثر افراد کے نام لئے ہیں جو ان کی پشت پناہی کرتے تھے انتظامیہ نے انہیں سخت سے سخت سزا دینے کا اعلان کیا ہے۔" ڈاکٹر سلمان کو اس خبر سے دلی خوشی ہوئی انہیں یوں لگا جیسے ان مجرموں کے خلاف آپریشن انتظامیہ نے نہیں خود انہوں نے کیا ہو!!

کیا آپ ہمیں اسٹیکرز کا آرڈر دے چکے ہیں؟

اگر آپ نے ادارہ آنکھ مچولی کو دعاؤں کے اسٹیکرز کا سیٹ منگوانے کے لئے آرڈر نہیں دیا تو یہ کام پہلی فرصت میں کر لیجئے۔ کیونکہ اسٹیکرز کے نئے سیٹ چھپ کر آچکے ہیں۔ دیدہ زیب طباعت۔ وقت کی ضرورت۔

۱۲ اسٹیکرز کا ھدیہ...... صرف =/۳۶ روپے

منگوانے کا پتا:

سرکولیشن منیجر: ماہنامہ آنکھ مچولی I-پی آئی بی کالونی، کراچی ۷۴۸۰۵۔ فون 4942857 4948210

قاتل جو شہرت کا بھوکا تھا

عبدالستار خان طاہر

یہ مئی کے پہلے ہفتے کا واقعہ ہے، پیرس کے ایک باغ میں ایک بچے کی لاش ملی۔ بچے کی عمر گیارہ سال تھی۔ لاش کی حالت یہ تھی کہ اس کا سر اور چہرہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ بچے کا گلا ہاتھوں سے دبا کر مارا گیا ہے۔ بچے کے قتل کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی۔ اس خبر کا عجیب پہلو یہ تھا کہ یہ خبر پولیس کی طرف سے اخباروں کو نہیں دی گئی تھی بلکہ کسی گمنام آدمی نے دی تھی۔ ہر اخبار کی خبر کے الفاظ ایک جیسے تھے۔ بچے کے والدین نے لاش پہچان لی اور انکشاف ہوا کہ بچہ تین روز سے لاپتہ تھا۔ والدین سے پولیس نے پوچھا کہ انہوں نے بچے کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس کو کیوں نہ دی؟ باپ نے جواب دیا کہ وہ اسے خود تلاش کرتا رہا ہے۔ کیس پیرس کے محکمۂ سراغ رسانی کے ایک افسر سیمسن (Samson) کے حوالے کردیا

گیا۔ اس کا شمار فرانس کے ان چند بہترین سُراغرسانوں میں ہوتا تھا جو اس فن کے صرف ماہر ہی نہیں بلکہ سُراغرسانی کو انہوں نے جنون بنا رکھا تھا۔ سیمسن جنونی سُراغ رساں بھی تھا اور نفسیات کا ماہر بھی۔

سیمسن ابھی اس کیس کے بارے میں غور و خوض ہی کر رہا تھا کہ اسے ایک خط ملا جس نے سیمسن کو حیران کر دیا۔ یہ خط "قاتل" کا تھا۔ نیچے قاتل لکھا ہوا تھا۔ خط سیمسن کے نام تھا۔ جس میں لکھا تھا۔ "بچہ بازار میں بے کار گھوم پھر رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ پیار سے باتیں کیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ باپ کے ڈر سے گھر نہیں جانا چاہتا۔ میں نے بچے کو اپنی کار میں بٹھالیا اور اس کے باپ کو ٹیلی فون پر رقم بتا کر کہا کہ میری مطلوبہ جگہ پر رقم پہنچادو اور بچے کو زندہ لے جاؤ۔ باپ وعدے کے باوجود رقم لے کر نہ آیا تو میں نے تیسرے دن اسی جگہ بچے کو لے جا کر قتل کر دیا۔"

سیمسن نے بچے کے باپ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسے ایسا کوئی پیغام نہیں ملا۔ سیمسن نے خط لیبارٹری میں بھیج دیا تاکہ تحریر اور اُنگلیوں کے نشانات شناخت کر کے تفتیش آگے چلائی جائے۔ لیبارٹری نے اُنگلیوں کے نشان واضح کر لیے۔ انہیں سزا یافتہ پیشہ ور مجرموں کی اُنگلیوں کے ان نشانات سے ملایا گیا جو پولیس ہیڈ کوارٹر میں محفوظ تھے۔ لیکن نشان کسی بھی مجرم کی اُنگلیوں کے نشانات سے نہ ملے۔ ماہرین نے رپورٹ دی کہ یہ نشان ریکارڈ میں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس مجرم کو ابھی سزا نہیں ہوئی بلکہ وہ کبھی مشتبہ کی صورت میں پولیس کے سامنے نہیں آیا۔

یہ خط دوسرے دن کے اخباروں میں بھی شائع ہوا جو پولیس نے اخباروں کو نہیں دیا تھا' بلکہ "قاتل" کی طرف سے ہر ایک اخبار کو ملا تھا۔ سیمسن کا تجربہ کار دماغ سمجھ گیا کہ قاتل تشہیر پسند ہے اور وہ پیشہ ور قاتل بھی نہیں۔ تین روز بعد سیمسن کو قاتل کا ایک اور خط ملا جس میں لکھا تھا کہ بچے کی ایک ٹانگ پر چھوٹا سا زخم تھا۔ جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس خط کے ملتے ہی پیرس کے تمام ڈاک خانوں کی بھی نگرانی شروع ہو گئی۔ خفیہ پولیس کے آدمی ہر ڈاک خانے سے تقسیم ہونے والی ڈاک دیکھتے تھے تاکہ معلوم ہو جائے کہ خط کون سے ڈاک خانے کے علاقے سے لکھے جا رہے ہیں۔ دو روز بعد ایک اور خط آیا۔ اس سے اگلے روز ایک اور خط آیا اور ایک خط پھر دوسرے دن آگیا۔ ان خطوط کی نقلیں قاتل نے اخباروں' ریڈیو اور ٹیلی وژن کو بھی بھیجیں۔ تمام خطوط تحریر سے ایک ہی ہاتھ کے

لکھے ہوئے تھے اور اُنگلیوں کے نشان بھی ایک ہی جیسے تھے۔ جو خط ٹی وی کو لکھا گیا تھا وہ خبریں سُنانے والی ایک لڑکی کے نام تھا۔ قاتل نے اسے لکھا تھا کہ اس نے ابھی تک اس بچے کے قتل کی خبر کیوں نہیں سُنائی اور ان خطوط کا ذکر کیوں نہیں کیا جو وہ لکھ رہا ہے۔

ایک اور خط میں قاتل نے سیمسن کو صرف اتنا لکھا۔ "تم لوگوں نے بچے کی قمیض تلاش نہیں کی۔ گلی نمبر ۳۰۶ جہاں ختم ہوتی ہے۔ وہاں سے کچھ آگے ایک کھڈ ہے۔ قمیض وہاں پڑی ہے۔ بچے کی لاش پر اس کی قمیض نہیں تھی۔ اس کی ماں نے بتایا کہ تھا کہ بچہ قمیض پہن کر باہر گیا تھا۔ اب قاتل کے خط کے مطابق سیمسن نے کھڈ میں جا کر دیکھا تو بچے کی قمیض وہاں جھاڑیوں میں پڑی تھی ۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ قمیض یہاں کیوں پڑی ہے؟ یہ خطوط اخباروں میں بھی تسلسل سے شائع ہو رہے تھے۔ پیرس کے لوگ جو اس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اب خوف و ہراس میں مبتلا ہو گئے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ کوئی مجرم ایک بچے کو قتل کر کے پولیس کو بیوقوف بنا رہا ہے اور پولیس کی تفتیش ابھی ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی ہے۔ اگر کچھ معلومات حاصل ہوئی تھیں تو وہ مجرم نے خود ہی خطوں کے ذریعے دی تھیں۔ مگر لوگ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ سیمسن قاتل کی تشہیر پسندی سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ قاتل خود ہی وہ معلومات دے رہا تھا جو سیمسن اور اس کا کارندوں کو مہینوں کی سراغرسانی کے بعد بھی نہ مل سکتیں اور وہ بھی شاید صحیح نہ ہوتیں۔ سیمسن اخبار کے ایڈیٹروں کی حوصلہ افزائی کرتا کہ وہ قاتل کی طرف سے آئے ہوئے خطوط نمایاں کر کے شائع کرتے ہیں۔ اکثر مجرم پولیس کو ایک دو خطوط لکھا کرتے ہیں۔ مگر وہ پولیس کو گمراہ کرنے کی خاطر لکھے جاتے ہیں۔ اس کیس میں مجرم جو معلومات دے رہا تھا۔ وہ بالکل صحیح تھیں۔ سیمسن کی اب کوشش یہ تھی کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ مجرم کی حوصلہ افزائی اور وہ خط کی لکھتا رہے۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ ہونے کے علاوہ نفسیات کا بھی ماہر تھا۔ اس لئے وہ جان گیا کہ یہ قاتل تشہیر کے علاوہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ پیرس کے لئے دہشت بن جائے اور لوگ اسے پُر اسرار اور درندہ سمجھنے لگیں۔ وہ اب دن میں دو دو خط پوسٹ کرنے لگا تھا اور ان خطوط میں اس نے اپنی عادات اور اپنے کردار کے متعلق بھی اشارے دینے شروع کر دیئے تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ وہ آوارہ اور بدقماش آدمی ہے۔ اس کی تحریروں سے یہ اظہار بھی ہوتا تھا کہ اس کے خط جب اخباروں میں شائع ہوتے ہیں تو اسے ذہنی سکون ملتا ہے۔

سیمسن نے ایک چال یہ چلی کہ ایک پریس کانفرنس بلوائی جس میں تمام اخباروں کے نامہ نگاروں کو بلایا گیا۔ سیمسن نے نامہ نگاروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پولیس کو ایک ایسے قاتل سے پالا پڑا ہے۔ جسے گرفتار کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ یہ قاتل غیر معمولی طور پر دلیر اور سفاک ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اس نے ابھی تک کسی اور بچے کو قتل نہیں کیا۔ سیمسن نے نامہ نگاروں کو اسی قسم کا طویل بیان دیا جو اگلے روز ہر ایک اخبار میں شائع ہوگیا۔ اس بیان نے لوگوں پر دہشت طاری کردی۔ سیمسن نے نامہ نگاروں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ بیان شائع کرانے سے اس کا مقصد کیا ہے۔ بعض اخباروں نے سیمسن کے خلاف ایڈیٹوریل لکھے۔ انہوں نے لکھا کہ "سیمسن جیسا کامیاب اور تجربہ کار سُراغرساں یہ کہہ دے کہ قاتل کو گرفتار کرنا ناممکن ہوگیا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیمسن کبھی بھی ایک اچھا سُراغرساں نہیں رہا یا اب وہ اس کیس میں قاتل کی مدد کررہا ہے اور پیرس کے لوگوں پر دہشت طاری کرنا چاہتا ہے۔" ایک اخبار نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس قاتل کو گرفتار کرنا مُشکل نہیں۔ سیمسن جانتا ہے کہ قاتل کون ہے اور وہ کہاں ہے؟ سیمسن اس کیس کو پیچیدہ، پُراسرار اور دہشت انگیز بنا کر پبلک کے سامنے ہیرو بننا چاہتا ہے۔ پبلک کو خوف و ہراس میں مبتلا کر کے ایک روز سیمسن خاموشی سے قاتل کو پکڑے گا اور پھر ظاہر کرے گا اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک بڑے ہی خطرناک قاتل کو پکڑا ہے۔"

سیمسن کے بالائی حکام نے اس سے جواب طلبی کی اور اسے تنبیہہ کی کہ وہ دیانت داری سے تفتیش کرے ورنہ تفتیش کسی اور کو دے دی جائے گی جو اس کی بے عزّتی کا باعث بنے گی۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ سیمسن نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو کیا جواب دیا۔ البتہ اس نے یہ خبر بھی اخباروں میں شائع کرادی کہ محکمے نے اس سے جواب طلبی کی ہے۔ اس نے تفتیش ختم ہونے کے بعد یہ انکشاف کیا تھا کہ اخباروں نے اس کے خلاف جو ایڈیٹوریل لکھے تھے۔ وہ بڑے کام کے تھے۔ دراصل قاتل چاہتا ہی یہی تھا کہ اس کی واردات کو خوب تشہیر ملے اور وہ ایک پُراسرار قاتل بن جائے۔ قاتل نے سیمسن کو ایک اور خط لکھا۔ اس نے لکھا۔ "مجھے کثیر رقم درکار ہے۔ اس بچے سے مجھے کچھ نہ مل سکا۔ اب میں ایک اور بچے کو اغوا کروں گا اور اس کے عوض رقم طلب کروں گا۔ اگر رقم نہ ملی تو تمہیں ایک اور قتل کی سُراغرسانی کرنے پڑے گی۔ میں کسی امیر آدمی کا بچہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ اگر مجھے یہ بچہ بھی قتل کرنا پڑا تو تمہیں کوئی خط نہیں لکھوں گا۔ اس کے بعد

پیرس میں ہر روز ایک بچہ قتل ہوا کرے گا۔"

حسبِ معمول قاتل نے اس خط کی نقلیں تمام اخبارات کو بھیجیں جو شائع کردی گئی۔ اس سے دہشت اور خوف و ہراس میں اضافہ ہوگیا۔ لوگوں نے اپنے بچوں کو گھروں سے باہر نکلنے سے منع کردیا۔ بچے اسکول جاتے تو مائیں یا باپ ان کے ساتھ جاتے اور ساتھ لاتے۔ شہر میں خصوصاً" اسکولوں کے اردگرد پولیس کے پہرے میں اضافہ کردیا گیا۔ دو دوز بعد سیمسن کو قاتل کا ایک اور خط ملا جس میں اس نے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا "فرانس کی حکومت نے پیرس کے بچوں کی حفاظت کے لئے پوری پولیس فورس کی ڈیوٹی لگادی ہے۔ میں جب بچہ تھا تو میری حفاظت کسی نے نہیں کی تھی۔ میرا بچپن تلخیوں میں گزرا ہے۔" اس خط میں اس نے اس کار کے بارے میں لکھا جس میں وہ مقتول بچے کو بٹھا کر لے گیا تھا۔ یہ کاریں فرانس میں بنتی تھیں۔ پولیس پر ایک ایک نئی مصیبت آن پڑی اس قسم کی تمام کاروں کے مالکوں کی چھان بین اور پوچھ گچھ شروع کردی گئی۔ یہ مہم شہریوں کے لئے بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ ایک اخبار نے قاتل کے متعلق شائع کیا جس میں ثابت کیا گیا کہ قاتل ذہنی مریض معلوم ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل پاگل ہو۔ دوسرے روز اسی اخبار کے ایڈیٹر کو قاتل کا خط ملا لکھا تھا۔ "میں الجزائر میں فرانسیسی فوج میں چھاتہ بردار تھا۔ میرا کمانڈر کرنل "ماسو" تھا۔ ایسے سفاک کرنل کی زیرِ کمان کسی سپاہی کا پاگل ہوجانا حیران کُن نہیں۔"

موجودہ آزاد الجزائر سے پہلے اس پر فرانس کا قبضہ تھا۔ الجزائر کے مسلمانوں نے دس سال جنگ آزادی لڑی اور آزادی حاصل کی تھی۔ فرانسیسیوں نے ان پر ظلم و تشدد کی حد کردی تھی۔ ان میں ایک فرانسیسی کرنل "ماسو" بھی تھا جو درندہ صفت تھا۔ جو الجزائری مُسلمان اس کے ہاتھ چڑھ جاتا اسے وہ غیر انسانی اذیتیں دے دے کر جان سے مار ڈالتا تھا۔ قاتل نے جب اپنے خط میں اس کرنل کا نام لکھا تو پولیس نے اس کی یونٹ کا ریکارڈ دیکھا مگر یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ ان میں قاتل کون ہے۔ ایک روز سیمسن کے ساتھ قاتل نے ٹیلی وژن پر بات کی۔ اس نے کہا۔ "میں قاتل بول رہا ہوں۔ یہ نہ بھولنا کہ میں ایک اور بچے کو قتل کرنے والا ہوں۔" اور فون بند ہوگیا۔ ادھر اخبار والوں کو ایک اور خط ملا جس میں صرف یہ فقرہ لکھا۔ "ایک سنسنی خیز حادثے کا انتظار کرو۔" اس سے ایک آدھ روز بعد پیرس کے ایک مضافاتی ریلوے اسٹیشن پر ایک آدمی ٹہل رہا تھا۔ جس کی طرف سے کسی نے توجہ نہ دی کیونکہ لباس سے مزدور سا لگتا تھا۔ ریل گاڑی

آئی اور جب گاڑی چل پڑی تو اس آدمی کے ہاتھ میں ایک کتاب سی تھی وہ اس نے چلتی گاڑی میں گارڈ کے کمرے میں پھینک دی۔ گاڑی نے اگلے اسٹیشن پر یہ کتاب پولیس کو دے دی۔ پتہ چلا کہ یہ کارٹونوں کی کتاب مقتول بچے کے پاس تھی۔

اس وقت تک سیمسن کے پاس قاتل کے تیس خطوط جمع ہو چکے تھے۔ ان میں ایک خط میں یہ بھی لکھا تھا۔ "بچہ تین دن میرے پاس رہا اور منت سماجت کرتا رہا کہ میں اسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ بچہ پیار کا بھوکا تھا۔ اس کے ماں باپ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بچہ اس گھر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مگر وہ میرے ہاتھوں قتل ہوگیا جس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اس سے مسرت حاصل ہوئی ہے۔ میں بھی اس قسم کا بدقسمت بچہ ہوا کرتا تھا۔ اگر اس بچے کے والدین آپس میں لڑنے کے بجائے بچے کی تربیت پر توجہ دیتے تو وہ بڑا ہو کر نام پیدا کرتا۔ میں نے بچے کو جس ٹھکانے پر پہنچادیا ہے۔ وہ اس کے لئے بہت اچھا ہے۔ میں بھی اس ٹھکانے پر پہنچنا چاہتا ہوں۔"

سیمسن خود بھی نفسیات کی سُوجھ بُوجھ رکھتا تھا۔ اس نے یہ خطوط نفسیات کے ڈاکٹروں کے ایک بورڈ کے آگے رکھے بورڈ نے رائے دی کہ قاتل ذہنی مریض ہے۔ اس کے دل میں بچے یا اس کے والدین کے خلاف کوئی دشمنی نہیں۔ اس قاتل کا بچپن پیار اور شفقت کی محرومی میں گزرا ہے۔ اس کی ذہنی حالت روز بروز بگڑ رہی ہے۔ وہ خود پسندی کا شکار ہے۔ اس کی انا بہت نازک ہے۔ غرض ماہرین نفسیات نے اس کی تحریروں سے اس کی شخصیت اور عادات و اطوار کی رپورٹ مرتب کرلی۔ سیمسن نے اس کی جو جسمانی ساخت پیش کی۔ وہ اس طرح کی تھی کہ اس قد درمیانہ ہے۔ بلکہ اس سے بھی چھوٹا۔ یہ اندازہ اس نے قاتل کی تحریروں اور تجربہ بنا پر لگایا تھا۔

نفسیات کے ڈاکٹروں کی یہ رائے دُرست ثابت ہو رہی تھی کہ قاتل کا دماغ روز بروز خراب ہو رہا ہے۔ اس نے خطوط کا سلسلہ جاری رکھا۔ لفافے میں جو کاغذ نکلتا اس پر مرغی کے سر کی تصویر بنی ہوتی یا انسانی کھوپڑی کی۔ ایک تصویر جو پنسل سے بنائی گئی تھی۔ اس طرح تھی کہ ایک آدمی ایک درخت کے نیچے اوندھا پڑا تھا۔ نیچے لکھا تھا "قاتل" سیمسن کو ایک اور خط ملا جس میں قاتل نے لکھا تھا کہ کل وہ فلاں ہوٹل میں فلاں اخبار کے فلاں نامہ نگار کے ساتھ اس قتل کے متعلق باتیں کرتا رہا ہے۔ سیمسن نے اس نامہ نگار سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ واقعی ایک

آدمی جسے وہ نہیں جانتا تھا کہ کون ہے اس کے پاس بیٹھا اور واردات کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا نامہ نگار نے اس کا حلیہ تقریباً" وہی بتایا جو سیمسن نے اس کی تحریروں سے ذہن میں تیار کیا تھا۔ اس کا قد ٹھگنا بتایا گیا۔ پولیس نے اسی رات اس حلئے کے ایک آدمی کو پکڑلیا۔ اسے تشدد کا نشانہ بنایا، پوچھ گچھ کی مگر وہ اس بچے کا قاتل نہیں تھا۔

سیمسن نے اب طریقہ بدل دیا۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ قاتل کو بہت تشہیر مل چکی ہے۔ اس نے اپنے خطوں میں مزید معلومات دینے کا سلسلہ بند کردیا ہے۔ سیمسن نے تمام اخباروں کے ایڈیٹروں سے کہا کہ وہ اب قاتل کا کوئی خط شائع نہ کریں اور اس کے متعلق کوئی خبر بھی نہ چھاپیں۔ اخباروں نے تعاون کیا اور اس کیس کے متعلق چند دن کچھ بھی نہ لکھا۔ یہ واردات اتنی مشہور اور اہم ہوگئی تھی کہ اخباروں میں ہر روز پولیس کی کارگزاری شائع ہوتی تھی۔ اب اخبار اس ضمن میں خاموش ہوگئے۔ قاتل نے اخباروں کو خطوط لکھے جو سیمسن کو دے دئے گئے شائع کئے گئے قاتل نے سیمسن کو خط لکھا جس میں اس نے غصے کا اظہار کیا۔ اس نے لکھا کہ تم شاید یہ سمجھنے لگے ہو کہ میں قاتل نہیں ہوں۔ میرے قتل کا ثبوت ملے گا۔ سیمسن نے ہر روز "ڈیلی ایکسپریس" دیکھنا شروع کردیا۔ ایک روز اس اخبار کے خطوں کے کالم میں اسے قاتل کے نام کا ایک خط نظر آیا۔ جس میں قتل کی تفصیل لکھ کر قاتل نے لکھا تھا۔ "میں نے فرانس کی پولیس کے لئے مصیبت کھڑی کر رکھی ہے اور میں ہی اس بچے کا اصلی قاتل ہوں۔"

پیرس کے اخباروں کو بھی اس قاتل کے خطوط ملے تھے۔ لیکن کسی بھی اخبار شائع نہ کیا۔ سیمسن کو قاتل کا ایک اور خط ملا، لکھا تھا۔ "میں نے ایک اور بچے کو قتل کردیا ہے۔ جس کی لاش تمہیں کبھی نہیں مل سکے گی۔ اگر تمہیں یقین نہ آئے تو تم ایک کار میں اس بچے کے خون کے چھینٹے اور دھبے دیکھ سکتے ہو۔ میں نے یہ کار چُرائی تھی۔ اب نپولین کی قبر کے قریب کھڑی ہے۔"

سیمسن نے نپولین کی قبر والے علاقے میں ریوالوروں سے مسلح بغیر وردی پولیس پھیلا دی۔ وہاں بڑی ہی پُرانی ایک کار کھڑی تھی۔ سیمسن کو خطرہ تھا کہ کار میں بم رکھا ہوگا جو قریب جانے پر پھٹ جائے گا پوری احتیاط کے بعد وہ خود کار کے قریب گیا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر واقعی خون جما ہوا تھا۔ کار بہت ہی پُرانی اور بُری حالت میں تھا۔ سیمسن نے کار وہیں کھڑی رہنے دیں۔ اردگرد رہنے والے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ کار کس کی

ہے۔ بعض آدمیوں نے "لیگر" نام کے ایک آدمی کو اس کار میں چند بار دیکھا تھا۔ انہوں نے سیمسن کو بتایا کہ وہ اس کی رہائش سے واقف ہیں۔ پولیس کے دو آدمیوں کو بھیج کر "لیگر" کو بلایا گیا۔ وہ آگیا۔ سیمسن نے دیکھا کہ وہ ٹھگنے سے قد کا معمولی آدمی تھا۔ "یہ کار آپ کی ہے؟" سیمسن نے پوچھا۔ "جی ہاں۔" لیگر نے جواب دیا۔ "میری ہے" "کیا یہ چوری ہوگئی تھی؟" سیمسن نے پوچھا۔ "مجھے معلوم نہیں۔" لیگر نے جواب دیا۔ "اس کار کو کون چُرائے گا۔"

سیمسن نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ کار یہاں کیوں کھڑی ہے اور اس میں خون کس کا ہے۔ اس نے لیگر کے چہرے کا جائزہ بڑے غور سے لیا۔ لیگر کے ہونٹوں پر تبسم اور تبسم میں طنز کا رنگ نمایاں تھا۔ سیمسن کار کے عقب میں چلا گیا۔ جیسے کار کا معائنہ کررہا ہو مگر اس کی نظریں لیگر پر تھیں۔ اسے یہ بھی توقع تھی کہ لیگر ریوالور نکال کر اس پر گولی چلائے گا۔ یا ریوالور کی نالی اس کی طرف کرکے اس سے اپنی کوئی شرط منوائے گا، مگر لیگر کا تبسم مُسکراہٹ بن گیا تھا۔ "مسٹر لیگر!" سیمسن نے اچانک اس کے سامنے آکر کہا۔ "میں آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ایک قاتل کے سلسلے میں تفتیش میں شامل کررہا ہوں اور آپ کو یہ بھی بتادینا چاہتا ہوں کہ آپ گواہ کی بجائے مشتبہ بھی ہوسکتے ہیں۔"

"ضرور تلاشی لیں۔" لیگر نے کہا .....

"آئیں! میرے ساتھ آگے چلیں۔" لیگر اسی آبادی میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ یہ ایک بہت پرانی عمارت تھی جس کے کمرے میں مختلف لوگ رہتے تھے۔ لیگر سیمسن کو اس عمارت میں لے گیا۔ سیمسن اس کے پیچھے پیچھے جارہا تھا۔ لیگر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ سیمسن نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواروں کے ساتھ بے شمار تصویریں اور ہاتھ سے بنے ہوئے خاکے چسپاں تھے۔ پُرانی سی ایک میز پر بھی اسی قسم کی بہت سی تصویریں پڑی تھیں۔ ان میں اخباروں سے کاٹے ہوئے ان خبروں کے تراشے بھی پڑے تھے جو بچے کے ضمن میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ لیگر الگ کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ سیمسن نے اس کی مُسکراہٹ دیکھی، تصویریں دیکھیں اور اخباروں کے تراشے دیکھے تو اس نے بے ساختہ کہا۔ "مسٹر لیگر! اس بچے کو شاید تم نے ہی قتل کیا ہے۔" "بالکل نہیں۔" لیگر نے ہنس کر کہا۔ اسے ذرہ بھر پریشانی نہ ہوئی۔ سیمسن نے فوراً پینترا بدلا اور بولا۔ "نہیں..... نہیں تم قاتل نہیں ہوسکتے، تمہارا چہرہ بتارہا ہے کہ تم اتنے دلیر نہیں ہو کہ کسی کو قتل کرسکو۔" "تم بکواس کرتے ہو۔" لیگر نے چلّا کر

کہا۔ مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں ایسے کئی بچوں کو قتل کر سکتا ہوں۔" "آہستہ بولو یار!" سیمن نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا۔ "تم دلیر ہو سکتے ہو قاتل نہیں ہو سکتے۔ آہستہ بولو شک میں ہی پکڑے جاؤ گے۔" "میں کہتا ہوں میں دلیر ہوں قاتل بھی ہوں۔" لیگر نے غصّے میں کہا۔ "میں ثابت کروں گا کہ بچے کا قاتل میں ہی ہوں۔ کیا تم نے میری کار میں خون نہیں دیکھا؟"

"لاش کے بغیر کیسے یقین کرلوں کہ تم نے کار میں ایک بچے کو قتل کیا ہے؟" سیمن نے پوچھا۔ "میں لاش نہیں دکھا سکتا۔" لیگر نے کہا۔ "میں نے جسے قتل کیا تھا اس کی لاش تمہیں مل گئی تھی۔" "دوسرے بچے کو تم نے قتل نہیں کیا اس لئے اس کی لاش نہیں ملے گی۔" سیمن نے کہا۔ "تم میں اتنی جرأت نہیں کہ ایک کے بعد دوسرے بچے کو قتل کر سکو۔ تم میں اتنی عقل بھی نہیں کہ لاش کو ایسا چھپاؤ... کہ پولیس کو مل نہ سکے۔" سیمن نے کہا۔ لیگر نے غصّے سے کہا۔ "کیا یہ عقل کی بات نہیں کہ میں نے ہسپتال سے خون کی ایک بوتل چُرائی تھی اور یہ خون کار کی پچھلی سیٹ پر اُنڈیل دیا تھا۔ تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔"

سیمن نے سکون کی آہ لی کہ کوئی دوسرا بچہ نہیں ہوا۔ اس نے لیگر کو ساتھ لیا اور اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ لیگر نے اس انداز سے اقبالِ جرم کرلیا۔ جیسے وہ پولیس کو یقین دلانا چاہتا ہو کہ قاتل اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ بہت دلیر اور عقل مند انسان ہے۔ سیمن نے اس کی گزری ہوئی زندگی کے احوال و کوائف فراہم کیے۔ اس کا بچپن ایسے گھر میں گزرا تھا جہاں اس کے لئے پیار نہیں تھا اور کوئی سکون نہ تھا باپ اسے مارتا پیٹتا تھا اور وہ اس کی ماں کے ساتھ بھی بُرا سلوک کرتا تھا۔ لیگر بڑا ہوا تو وہ گلیوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ اس نے صرف اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ پھر گھر سے بھاگ گیا۔ نوجوانی میں وہ فوج میں بھرتی ہوگیا اور ٹریننگ کے بعد اسے الجزائر بھیج دیا گیا۔ اس وقت الجزائر میں مُسلمان جنگِ آزادی لڑ رہے تھے۔ فرانسیسی فوج کے دستے "باغیوں (مسلمان مجاہدوں) کی سرکوبی کے لئے کبھی ریگزاروں میں مارے مارے پھرتے اور کبھی بستیوں میں۔ لیگر نے وہاں بہت قتل و غارت اور بربریت دیکھی اس کے اردگرد ہر وقت گولیاں چیختی اور گرینیڈوں کے دھماکے گرجتے رہتے تھے۔ موت کا خوف ہر لمحہ اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ اسے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ فرانس کسی دوسری قوم کو غلام بنائے رکھنے کے لئے اس قوم کا کشت و خون کرتا رہے۔ ان تمام تر احوال و کوائف نے

مل جل کر اس کے دماغ کے خلیے ہلا ڈالے۔ بچپن کی تشنگی اور محرومیاں غالب آگئیں۔ اس نے نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلانے سے انکار کردیا۔ اس کی یونٹ کا کمانڈر کرنل ماسوا ایک ظالم شخص تھا۔ اس نے لیگر کو ظالمانہ سزا دی۔ پھر اسے فوج سے ڈسچارج کرکے فرانس بھیج دیا گیا۔ اس وقت اس کی نفسیاتی خامیاں اس کے دماغ پر غالب آگئیں۔ اس نے لوگوں کو بتانا شروع کردیا کہ وہ چھاتہ بردار ہے اور اس نے الجزائر میں ایسے ایسے کارنامے کر دکھائے کہ اپنے افسروں کو حیران کردیا ہے۔

نومبر ۱۹۶۳ء میں امریکہ کا صدر کینیڈی قتل ہوگیا تو اس کے قاتل "اوسوالڈ" کی تصویر اخباروں میں شائع ہوئی۔ اوسوالڈ کی شکل لیگر سے ملتی جلتی تھی۔ لیگر نے یہ کہنا شروع کردیا کہ میں اوسوالڈ ہوں اور میں نے ہی کینیڈی کو قتل کیا ہے۔ اس کی لاف زنی بڑھتی گئی۔ وہ اپنے آپ کو شاعر بھی سمجھتا تھا اور متعدد کتابوں کا مصنف بھی۔ اس نے گرفتار ہوکر اپنے بیان میں کہا تھا۔ "میں نے جب اس بچے کو اغوا کیا تو بچے نے مجھے اپنے گھر کے حالات سنائے میرے دل میں اس کے باپ کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی۔ میں اس کے باپ کو سزا دینا چاہتا تھا۔ بچے نے مجھے کہا کہ میں اسے اپنے پاس رکھ لوں۔ وہ مجھ سے پیار مانگتا تھا۔ میرے پاس پیار کہاں! میں نے کبھی پیار نہیں دیکھا۔ میں نے اس خیال سے بچے کو قتل کردیا کہ اگر یہ زندہ رہا تو اس کی زندگی میری طرح گزرے گی۔ میں نے اسے دُکھ اور اذیت سے نجات دلا دی۔" لیگر پولیس کو خط لکھ کر ذہنی سکون حاصل کرتا تھا۔ اخباروں میں اپنی تشہیر دیکھ کر اسے مسرّت حاصل ہوتی تھی۔ وہ اہمیت چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ عدالت نے ماہرینِ نفسیات کی رپورٹ لی۔ بورڈ نے اسے پاگل قرار دے دیا اور عدالت نے اسے پاگل خانے بھیج دیا۔ عدالت نے اپنی رپورٹ میں لکھا : "لیگر سے بچے کا قتل پیار اور توجّہ کی محرومی کی وجہ سے ہوا۔ بچپن میں اسے ماں باپ کی طرف سے شفقت و توجہ نہ مل سکی جس کی وجہ سے وہ قاتل بن گیا۔ وہ ایک مظلوم قاتل ہے۔"

عدالت نے رپورٹ میں یہ بھی لکھا :
"بچوں کے ساتھ ایسا سلوک جب تک روا رکھا جاتا رہے گا، حالات ایسے واقعات... دہراتے رہیں گے!؟"

مولانا جلال الدین رومیؒ : علم کا غلط استعمال سانپ کی طرح ڈستا ہے لیکن صحیح استعمال مددگار ثابت ہوتا ہے۔
افشاں بشیر، کراچی

ایک جنگل کی کہانی

محمد عادل منہاج

ظالم ظلم کر رہے تھے اور ظلم کرنے والوں کا تعلق انتظامیہ سے تھا!!

شیر کی "شیری" اب تو بالکل ہی رخصت ہو چکی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا کام تو اب بس کھانا پینا اور سونا ہی رہ گیا ہے۔ عرصہ ہوا وہ اپنی رعایا کے حال سے بے خبر تھا۔ اسی لئے اب اس کا وہ علاقہ جو کبھی امن و سکون کا گہوارہ تھا ظلم و ستم کے بازار میں بدل چکا تھا۔ امن پسند جانور اس زمانے کو یاد کر کے آہیں بھرتے۔ یہ کوئی اتنی پُرانی بات نہ تھی۔ صرف چند سال قبل تک جنگل کا یہ علاقہ جس پر شیر حکومت کرتا تھا، جنگل کا سب سے بہترین علاقہ کہلاتا تھا۔ شیر اپنی رعایا پر بہت مہربان تھا۔ وہ کبھی اپنے علاقے میں شکار نہ کھیلتا بلکہ دشمن کے علاقے میں گھس کر اپنا شکار تلاش کیا کرتا اور پھر وہ دشمن کے علاقے کے بھی معصوم جانوروں کو شکار نہ کرتا بلکہ خطرناک جانوروں کو اپنا نشانہ بناتا تھا۔

اردگرد کے علاقوں کے حکمران اس سے

بے حد تنگ تھے۔ انہوں نے کئی بار شیر کے علاقے پر حملہ کیا مگر شیر کی بہادری کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ وہ مردانہ وار دشمنوں کا مقابلہ کرتا اور انہیں مار بھگاتا۔ اس کی رعایا بھی اس کا بھرپور ساتھ دیتی ہمسایہ علاقے کا حکمران "چیتا" تو اس سے سخت نالاں تھا۔ وہ شکار کا بے حد شوقین تھا اور اکثر اپنے ہی علاقے کے ہرنوں کا شکار کرتا اور چٹخارے لے کر گوشت کھاتا۔ اس کی رعایا اس سے سخت خوفزدہ رہتی۔ ہر کسی کو دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں ان کا بادشاہ آج انہیں ہی نہ نشانہ بنا ڈالے۔ اس وجہ سے اکثر جانور سرحد پار کر کے شیر کے علاقے میں چلے جاتے اور اس سے پناہ طلب کرتے جو انہیں فوراً مل جاتی۔ یہ صورتحال چیتے کے لئے انتہائی غضبناک تھی۔

ایک دن اس نے کئی علاقوں کے اپنے جیسے ظالم حکمرانوں کو دعوت پر بلایا اور شیر کا مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔

"شیر ہمارے لئے مسئلہ بنتا جارہا ہے اور اب تو میں نے سُنا ہے کہ میرے علاقے کے جانور شیر کو اُکسا رہے ہیں کہ وہ میرے علاقے پر حملہ کر کے قبضہ کرلے۔" چیتا غصے میں دھاڑ رہا تھا۔

"یہ تو واقعی خطرناک صورتحال ہے۔ آج آپ کی رعایا باغی ہوگئی ہے تو کل ہماری بھی ہوسکتی ہے اور اگر شیر نے واقعی آپ کے علاقے پر حملہ کردیا تو خطرہ ہے کہ کہیں وہ کامیاب نہ ہوجائے اور پھر یہ سلسلہ آگے بھی بڑھ سکتا ہے۔"

گینڈے نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے ہی ہمیں مل کر اس پر ہلّہ بول دینا چاہئے۔" چیتے نے کہا۔

"بالکل ٹھیک! میں نے سُنا ہے کہ اس کے علاقے میں بہت ذائقہ دار ہرن بھی پائے جاتے ہیں۔" بھیڑیئے نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں شیر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیئے۔" یہ آواز لومڑی کی تھی۔

"یہ.... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" چیتا غصے میں بولا۔ لومڑی اس کی مشیر تھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ لوگ پہلے بھی اس پر حملہ کر کے ناکامی کا منہ دیکھ چکے ہیں۔ شیر کو اپنی طاقت پر بھروسہ ہے لہٰذا ہمیں پہلے اس کی طاقت کو زائل کرنا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟" سب بول اُٹھے۔

"اسے آرام طلبی اور عیاشی میں مبتلا کر کے۔" لومڑی مُسکرائی۔

"آخر تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" بھیڑیا بولا۔

"سنیئے! لومڑی بولی اور انہیں اپنا آئیڈیا بتانے لگی۔

☆ --- ☆ --- ☆

لومڑی کی چاپلوسانہ سفارت کام آئی اور شیر ایک مشترکہ اجلاس میں شرکت کرنے پر رضامند ہوگیا۔ اجلاس میں پہلے سب حکمرانوں نے جنگل کے مسائل پر روشنی ڈالی پھر چیتا مطلب کی بات پر آتا ہوا بولا۔ "شیر کے ساتھ اپنے پچھلے رویّے پر ہم سب شرمندہ اور نادم ہیں۔ ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوچکا ہے اور ہم شیر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔" سب نے تالیاں بجائیں۔ شیر جو بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ رحم دل بھی تھا وہ ان کی آنکھوں میں چھپا کینہ نہ دیکھ سکا اور ان پر اعتبار کر بیٹھا۔ بعد میں چیتے نے شیر سے علیحدگی میں ملاقات کی۔ لومڑی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نے اسے خوب مکھن لگایا۔

"جناب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ جیسے بہادر کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرے لہٰذا ہم آج کے بعد سے شکار خود آپ کو پہنچایا کریں گے۔" لومڑی نے کہا۔

"نن .... نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں شکار خود کرنا پسند کرتا ہوں۔ وہ بھی صرف خطرناک جانوروں کا۔" "مگر جناب آپ خود سوچیں اب تو ہم آپ کے دوست بن گئے ہیں آپ ہمارے علاقے میں تو شکار کریں گے نہیں۔ آپ کو بہت دور دور جانا پڑے گا۔ اس طرح آپ کا وقت ضائع ہوگا پھر یہ جنگل کے مسائل کون حل کرے گا۔ یہ شکار وغیرہ تو معمولی چیز ہے۔ آپ کو تو بڑے کام کرنے ہیں۔" چیتے نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا اور بالآخر وہ شیر کو رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بس اس کے بعد کیا تھا۔ ہر روز شیر کو صبح صبح شکار مل جاتا۔ ہاتھ پیر ہلائے بغیر کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے اس پر یہ خیال کہ اب ہر شخص اس کی عزت کرتا ہے اسے بڑا مانتا ہے۔ چیتے نے لومڑی کو شیر کے علاقے میں اپنا سفیر مقرر کردیا تھا۔ شکار ہضم کرنے کے فوراً بعد لومڑی مسائل کا ایک گٹھڑ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتی اور اس سے مشورے طلب کرتی۔ شیر کو بین الجنگلاتی مسائل میں اتنا اُلجھا دیا گیا کہ وہ اپنی رعایا کو بھول گیا۔ لومڑی اکثر اس کے علاقے کا دورہ کرتی اور اسے اطمینان دلاتی کہ علاقے میں ہر طرح

امن و سکون ہے۔ اصل خبر اس تک پہنچنے ہی نہ دیتی کہ اب یہاں بھی جھگڑے فساد شروع ہو چکے ہیں۔ کیونکہ اب داد رسی کرنے والا مُفت کا مال کھا کھا کر غیروں کی جھولی میں جا گرا ہے۔ اسے تو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ اب اکثر اس کے کھانے کے لئے چیتا اسی کے علاقے کے جانور ہلاک کر کے اسے پہنچا دیتا اور وہ اپنی ہی رعایا کو ہڑپ کر جاتا ہے۔

☆ --- ☆ --- ☆

اس دن جب اس کے مشیر بندر نے اسے خبر سنائی کہ اس کے علاقے کے جنوبی حصے پر جہاں ہرنوں کی اکثریت ہے بھیڑیوں نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا ہے۔ شیر کو بڑے دنوں بعد غصہ آیا۔ بھیڑیوں کی یہ جرأت کہ میرے علاقے پر قبضہ کریں جس سے سارا جنگل ڈرتا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اُٹھا کیونکہ کھا کھا کر بے حد موٹا ہو چکا تھا اور چونکہ خود سے شکار کرنا چھوڑ دیا تھا اور ہر وقت ایسے مسائل میں اُلجھا رہتا جو کبھی بھی حل نہ ہوتے لہٰذا لڑنا بھڑنا بھی بھول چکا تھا۔ مگر پھر بھی عزّت کا معاملہ تھا۔ شاید سوئی ہوئی غیرت جاگ اُٹھتی مگر لومڑی اچانک سامنے آگئی۔

"کہاں چلے جناب؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ بھیڑیوں نے ہمارے علاقے پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا ہے۔" وہ غصے میں بولا۔

"اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوا مگر آپ کو پہلے حالات کا جائزہ لینا چاہئے یوں ایک دم ان پر جا پڑنا مناسب نہیں۔" لومڑی بولی

"کیا مطلب؟ کیسے حالات! کیسا جائزہ؟ میں کہتا ہوں انہیں فوراً ہی سبق سکھانا چاہیئے بلکہ ان لوگوں کو بھی میرا ساتھ دینا چاہیئے آخر چیتے نے دوستی کا معاہدہ کر رکھا ہے۔"

"جی ہاں اسی لئے تو کہتی ہوں کہ پہلے چیتے سے مشورہ کر لیں۔ آیئے پہلے وہیں چلیں پھر مل کر کوئی کاروائی کریں گے۔" لومڑی اسے لے کر چیتے کے پاس پہنچی۔ "مجھے پہلے یہ خبر مل چکی ہے۔ میں نے خود بھیڑیوں سے بات کی تو انہوں نے مجھے تسلّی بخش جواب نہ دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت پہلے یہ علاقہ انہی کا تھا۔ اور آپ کے آباو اجداد نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔" چیتا بولا۔

"بکواس کرتے ہیں وہ۔ ہمیں فوراً ان پر حملہ کرنا ہوگا۔" شیر دھاڑا۔

"آرام سے۔ اس قسم کے کاموں میں جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ شاید آپ جانتے نہیں کہ ان بھیڑیوں کے پاس عجیب و غریب ہتھیار ہیں۔" چیتا بولا۔

"ہتھیار۔ کیا مطلب!! ہمارے ہتھیار تو یہ ہیں۔" شیر نے اپنا پنجہ لہرایا۔

"نہیں جناب اب زمانہ بدل چکا ہے۔ دراصل بھیڑیے کچھ عرصہ انسانوں کی دنیا میں گزار کر آئے ہیں اور سُنا ہے کہ وہاں سے کچھ عجیب اور خوفناک ہتھیار بنانا سیکھ آئے ہیں۔ اگر آپ نے ان پر اندھا دھند حملہ کیا تو وہ ان ہتھیاروں کی مدد سے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ پھر سارے علاقے پر ان کا قبضہ ہوجائے گا۔" چیتا بولا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟" شیر پریشان ہو کر بولا۔

"کرتے ہیں کچھ۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے ان سے بات کرنی چاہیے۔ بات چیت سے مسئلہ حل ہوجائے تو اچھا ہے۔ ان سے مذاکرات کرنے چاہیں اور انہیں سمجھانا چاہیے کہ یہ علاقہ دراصل آپ کا ہے۔ اس دوران ہم بھی خطرناک ہتھیار تیار کریں گے تاکہ انہیں منہ توڑ جواب دے سکیں۔" چیتا بولا۔

اور پھر بھیڑیوں کے ساتھ نہ ختم ہونے والی بات چیت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بھلا بھیڑیوں نے وہ علاقہ چھوڑنے کے لئے تو قبضہ نہیں کیا تھا۔ انہیں تو مُفت کی شکار گاہ مل گئی تھی۔ جس جانور کو چاہتے پکڑ لیتے اور ہضم کرجاتے۔ شیر اس بات چیت کے مرحلے سے تنگ آچکا تھا۔ مگر اب کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے بھیڑیوں کے پاس موجود ہتھیاروں کا ڈراوا دیا جاچکا تھا۔ چیتے بھی ہتھیار بنا رہے تھے۔ مگر شیر کو چند ناکارہ قسم کے لوہے اور لکڑی کے ٹکڑے ہتھیار کے طور پر دے دیئے جاتے اور اس پر احسان الگ جتایا جاتا۔ شیر کو محسوس ہورہا تھا کہ شاید یہ سلسلہ ساری عمر یونہی چلتا رہے گا۔ اور شاید چلتا رہتا اگر وہ واقعہ پیش نہ آجاتا جس نے شیر کو ہلا کر رکھ دیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

شیر کے سامنے اس کے بچے کی لاش پڑی تھی۔ شیر کا بیٹا جس نے بڑے ہو کر شیر کی جگہ سنبھالنا تھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ شیر کو یوں لگا کہ جیسے ہر طرف اندھیرا چھاگیا اور زور کا بھونچال آگیا ہے۔ وہ حلق پھاڑ کر چلّایا۔ اس کی دھاڑ دور دور تک سُنی گئی۔ جانور لرز اُٹھے۔ ایک عرصے بعد وہ اس طرح دھاڑا تھا۔ "کیسے ہوا ہے یہ؟ کس نے کیا ہے یہ ظلم؟" وہ روتے ہوئے بولا۔

"ہم سے کیا پوچھتے ہیں بادشاہ سلامت! ہماری باتوں پر تو آپ نے کان دھرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے اپنے سب مشیر یا تو غیروں کو بنایا

ہے یا ان کو جو غیروں کا دیا کھا رہے ہیں اور آپ کو جھوٹی خبریں سنا سنا کر خوش کرتے رہتے ہیں۔ آپ تو اپنے علاقے سے یوں غافل ہو چکے ہیں کہ ہم خود کو یتیم یتیم سا محسوس کرتے ہیں۔"

اس کا سابقہ مشیر بندر دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"آج ..... آج میں تمہاری ہر بات کا یقین کروں گا۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ میرے بچے کو کس نے ہلاک کیا ہے؟"

"تو سنیے عالم پناہ یہ پہلا ظلم نہیں جو آپ کے علاقے میں ہوا ہو۔ جب سے آپ نے چیتوں سے دوستی کی۔ اپنے علاقے سے غافل ہو گئے۔ انہوں نے آپ کو ایسا اُلجھایا کہ آپ نے سارا علاقہ ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور نوبت یہاں تک آگئی کہ ایک بڑے حصے پر بھیڑیے قابض ہو گئے اگر آپ اسی وقت انہیں للکارتے تو وہ بُزدل بھیڑیے یقیناً" بھاگ جاتے مگر آپ نے اپنی طاقت پر بھروسہ کرنے کی بجائے چیتے کی اطلاعات پر بھروسہ کیا۔ اس نے آپ کو بھیڑیوں کے نام نہاد ہتھیاروں کا ڈراوا دے دے کر اس حصے میں ظلم و ستم کا بازار گرم رکھا ہے۔ آج صبح بھی وہاں بھیڑیے ایک ہرن کو پکڑ کر لئے جا رہے تھے۔ تو نہ جانے شہزادہ شیر کہاں سے پہنچ گیا اور انہیں للکار بیٹھا۔ بس پھر کیا تھا۔ سب مل کر اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے مار ڈالا۔ ویسے انہیں یہ پتہ نہ تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ ورنہ شاید وہ اسے ہلاک نہ کرتے اور ابھی انہوں نے آپ سے بہت سے کام لینا تھے۔" بندر نے ساری تفصیل سنائی۔

شیر کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک ایک کر کے سارے پردے ہٹتے جا رہے تھے کہ کس طرح ان لوگوں نے اسے جال میں پھانس کر اپنے علاقے سے غافل کیا۔ اسے مُفت کا مال کھلا کھلا کر خوب عیاشی کروائی اور آرام طلب بنا دیا۔ ایک دم ہی شیر کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ وہی پُرانا شیر بن گیا۔ جس کی دہشت سارے جنگل پر تھی۔ وہ دھاڑا اور پھر اپنے علاقے کو آزاد کروانے چل پڑا۔ اس کی رعایا اس کے ساتھ تھی۔ اگر بادشاہ اپنی رعایا سے محبت کرنے والا ہو تو رعایا بھی اس کی خاطر جان خطرے میں ڈال دیتی ہے۔

بھیڑیوں کے لئے یہ نیا منظر تھا کہ سارے علاقے کے جانور شیر کی کمان میں آ رہے ہیں۔ انہوں نے فوراً" ایک ہرکارہ چیتے کی طرف دوڑایا مگر اس سے پہلے حملہ ہو چکا تھا۔ شیر اپنی بھولی ہوئی بہادری کے جوہر دکھا رہا تھا۔ بھیڑیوں کے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے۔

وہ آج تک کمزوروں پر ظلم ڈھاتے آئے

تھے۔ برابر والے سے مقابلہ کرنا بھلا انہوں نے کہاں سیکھا تھا۔ ان کے وہ ہتھیار جن کے خوف نے آج تک شیر کو روکے رکھا، کہیں نظر نہ آئے۔ ان کے پاس بھی وہی ہتھیار تھے جو شیر کے پاس تھے یعنی پنجہ۔

مگر شیر کے پنجے میں حق تھا اور بھیڑیوں کے پنجے میں باطل لہٰذا نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ جلد ہی وہ میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

چیتوں نے لڑائی میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ تو بس دور سے تماشا دیکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کا کام تو گیدڑ کو بھبھکیاں دینا تھا کہ چل گئیں تو ٹھیک ورنہ کسی اور کی گیدڑ بھبھکی کی تیاری میں لگ جاتے۔

شیر نے دیکھا کہ ایک سمت بھیڑیوں کا سردار بھاگا جارہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے تو پکڑنا چاہئے لہٰذا فوراً اس کے پیچھے دوڑا۔ بھیڑیئے نے مڑ کر دیکھا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے اپنی رفتار اور بڑھادی مگر شیر اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس کی دم پکڑ کر کھینچی۔ مگر یہ کیا!! دم کے ساتھ ایک لبادہ سا اس کے ہاتھ میں آگیا اور بھیڑیا آگے بھاگتا چلا گیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ بھیڑیا نہیں بلکہ ایک گیدڑ تھا اور اس نے بھیڑیے کا بھیس بدل رکھا تھا۔ اب اس کے جسم پر چڑھا بھیڑیئے کا لباس اس کے ہاتھ میں تھا اور گیدڑ جان بچا کر بھاگ نکلا تھا۔ جلد ہی بقایا جانور بھی ادھر آگئے۔

"فتح مبارک ہو عالم پناہ! خیر تو ہے۔ آپ کچھ حیران سے ہیں۔" بندر بولا۔

"ہاں - یہ دیکھو میں بھیڑیے سردار کا پیچھا کر رہا تھا۔ میں نے اس کی دم کھینچی تو یہ بھیڑیئے کا لباس اس کے جسم سے اتر گیا اور جانتے ہو اندر سے ایک گیدڑ نکلا۔ اتنے عرصے سے ہمارے علاقے پر بھیڑیوں نے نہیں، گیدڑوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔" شیر بولا۔

"ہاں عالم پناہ۔ جب شیر اپنی طاقت پر بھروسہ کرنا چھوڑ دے تو گیدڑ بھی بھیڑیئے بن جایا کرتے ہیں۔' ایک بوڑھا ہرن بولا اور شیر نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آئندہ کبھی دشمن کی طاقت سے خائف نہیں ہو گا۔ اور غیروں کی فراہم کردہ اطلاعات پر کبھی کان نہ دھرے گا!!

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

طاؤد بلوچ، پسنی (بلوچستان) اپریل کا فروغ تعلیم نمبر بہت پسند آیا۔ "ان پڑھ باپ اور عالم بیٹے کا قصہ" "قرآن رشد و ہدایت" "علم پھیلاؤ" "حضرت ادریسؑ کی کہانی" "پتھر کی پلیٹ" "سائنس میں مسلمانوں کے کارنامے" "بچوں کے ادب میں سائنسی کہانی کی اہمیت" "عمل سے زندگی بنتی ہے" "نظام شمسی کی موت" "زندہ زمین" کی آخری قسط اور انعامی کہانی "شمعیں جلائے رکھنا" قابل دید تحریریں تھیں۔ نظمیں بھی پسند آئیں۔ **ہما صابر، کراچی۔** "فروغ تعلیم" اپنی مثال آپ تھا۔ آپ نے میرے مضمون کو قابل اشاعت بنا کر چھپنے کے قابل بنادیا۔ اس میں بہت ساری معلومات تو آپ نے ہی شامل کردیں۔ بے حد شکریہ ایڈیٹر صاحب!

○ --- ایڈیٹر کا کام ہی تحریروں کی نوک پلک درست کرنا ہے۔ ایڈیٹر کی رہنمائی سے ہی نئے ادیبوں کو آگے بڑھنے کے مواقع ملتے ہیں۔ **محمد ریاض، حیدر آباد۔** "فروغ تعلیم" نمبر علمی معلومات سے بھرا پڑا تھا۔ مشہور شخصیات کے علم سے متعلق اقوال بے حد پسند آئے۔ گو کہ کہانیاں مضامین کی نسبت کم تھیں لیکن مضامین کہانی کے ہی انداز میں لکھے گئے تھے۔ **کاشف جمیل، تربت۔** آنکھ مچولی 20 تاریخ کو ملا، سب کہانیاں اچھی تھیں۔

ثوبیہ اقبال' کراچی۔ چند لطائف ارسال کئے تھے آپ نے شائع کیوں نہیں کئے۔ ○ ---بھئی آپ کے لطائف چٹپٹے نہیں تھے' مصالے دار لطائف روانہ کیجئے۔ **شمائلہ ظفر' گوجرہ۔** شمارہ بہترین رہا تمام ہی کہانیاں مزے دار تھیں۔ **صائمہ محمود' کراچی۔** آنکھ مچولی حسب توقع دیر سے ملا دیر سے ملنے کی وجہ سے خط لکھنے میں دشواری ہو رہی ہے کہ پھر خطوط باری آنے پر شائع کئے جاتے ہیں۔ **سعیدہ طاہرہ' قبولہ شریف۔** آپ کا رسالہ معیار کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہے' ہر طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے آپ کا ایک خاص نمبر پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں "جمائی" کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ جمائی لینے سے ذہن اور جسم تندرست اور چاق و چوبند ہوجاتا ہے اور اس سے دل کی دھڑکن اور خون کا دباؤ بھی صحت مند ہوجاتا ہے۔ گویا مجموعی اور حتمی طور پر "جمائی لینے" کے عمل کو تندرستی اور صحت مندی کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حضورؐ نے فرمایا ہے۔ "جہاں تک جمائی کا تعلق ہے' یہ شیطان کی جانب سے ہے پس تم میں سے جس کو بھی جمائی آئے وہ اسے حتی المقدور روکے کیوں کہ شیطان جمائی کے وقت تمہارے منہ میں ہنستا ہے۔" گویا یہ ایک شیطانی فعل ہے۔ اس سے جسم کا خود کار نظام ڈھیلا پڑجاتا ہے اور انسان بوجھ و گرانی محسوس کرتا ہے۔ امید ہے آپ میرا یہ خط شائع کریں گے تاکہ قارئین آنکھ مچولی تک میری بات پہنچ سکے۔ **عمران شمس الدین' ٹنڈو آدم۔** میں آپ کو آخری دفعہ اپنی تحریر بھیج رہا ہوں مجھے معلوم ہے آپ اسے بھی ردی کی ٹوکری کا نشانہ بنادیں گے؟ ○ ---بھائی عمران! ہمارا نشانہ خطا ہی چلا گیا اب آپ جلدی سے کوئی دلچسپ اور معیاری سی تحریر ارسال کیجئے۔ **راجہ پرویز' گجرات۔** بکسٹال گیا تو وہاں آنکھ مچولی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کتابوں کے درمیان سجا ہوا تھا۔ اپنے دوست کے مشورے سے خرید لیا' پڑھا بہت ہی اچھا لگا۔ حیران ہوں کہ آنکھ مچولی پچھلے دس سالوں سے چھپ رہا ہے اور میں آج اس کا مطالعہ کررہا ہوں۔ **مولا بخش' پسنی۔** آنکھ مچولی میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور میں فروری ۱۹۹۶ء سے اس کا پرستار ہوں۔ رنگ برنگے معلوماتی صفحات' خوبصورت نظمیں' مفید معلومات' دلچسپ اور مزے دار کہانیاں اور انعامی سلسلے اس رسالے کی جان ہیں۔ **عادل خان' صوابی۔** رسالے کی قیمت عام رسالوں سے بہت زیادہ ہے اسے ذرا کم کیجئے۔ ○ ---بھئی عادل! یہ بھی تو دیکھئے جو دوسرے رسائل کی بات ہے آنکھ مچولی کا ان سے ایک الگ انداز اور ایک اپنا معیار ہے۔ آنکھ مچولی کی ٹیم آپ لوگوں کے لئے صحت مندانہ تفریح اور دلچسپی کے لئے اپنی پوری صلاحیتیں بروئے کار لاتی ہے۔ **محمد قاسم فانی رونجہ' (بلوچستان)۔** آنکھ مچولی یوں تو بہترین رسالہ ہے مگر اس کی قیمت غریبوں کی پہنچ سے دور ہے۔ ○ بھئی! علم والا کبھی غریب نہیں ہوتا۔ **محمد معزالدین بیگ' ٹیکسلا کینٹ۔** آنکھ مچولی ہر اعتبار سے ایک منفرد رسالہ ہے اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے رسالے میں ہونی چاہئیں۔ میں یہ بات آپ کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ دل سے کہہ رہا ہوں۔ ○ ---ہمیں یقین ہے

کہ آپ دل سے کہہ رہے ہیں کیوں کہ خوشبو کبھی کسی تعریف کی محتاج نہیں ہوتی۔**اشوک چند' تج (بلوچستان)**۔معصوم بچوں کی اموات کے کئی اسباب ہوتے ہیں' ہنگامے' حادثات' بجلی کے ننگے تار' کھلے مین ہول' بازار کی گلی سڑی اشیا میرا آٹھ سالہ معصوم بچہ اسکول کے کھلے مین ہول میں گر کر مرگیا۔ تین ماہ میں تین بچے اس کھلے مین ہول کی نذر ہوچکے ہیں۔ انتظامیہ کو رپورٹ کی' ہوم سیکریٹری سندھ کو ایوان صدر نے لکھا ہے کہ فوری انکوائری کریں لیکن کچھ نہیں ہوا۔ ○ ---اللہ تعالیٰ آپ کے معصوم بچے کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ اور آپ کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مظلوم بچے نمبر بچوں پر ہونے والے مظالم پر سے پردہ اُٹھانے کے لئے ہی شائع کیا جارہا ہے۔**محمد فیاض' لاہور**۔آنکھ مچولی میں صحابہ کرامؓ پر معلومات عامہ کا سلسلہ اچھا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اسلامی کوئز بکس انعام میں دیں۔**قیصر محمود قیصر' مانسہرہ**۔"ممتا" اور "قیمتی راز" روانہ کی تھیں لیکن ان کے بارے میں آپ نے کوئی اطلاع ہی نہیں دی۔ ○ ---ایک راز کی بات آپ کو بتا رہے ہیں کہ آنکھ مچولی میں نئے ادیبوں کی مختصر' دلچسپ اور معیاری تحریریں پہلے جگہ پاتی ہیں آپ ایسی ہی کوئی تحریر بھیجئے ناں!**سید محمد ظفر' مظفر آباد**۔میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کے لئے آنکھ مچولی سے اچھا شائد ہی کوئی رسالہ ہو' رنگین تصاویر' عمدہ طباعت' اعلیٰ مضامین' مزے دار کہانیاں اور خوبصورت نظموں کی وجہ سے اس کا ایک منفرد مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑوں کے لئے بھی اس رسالے میں بے حد کشش ہے مجھے ہی دیکھ لیجئے کہ بچپن سے اس رسالے کا قاری ہوں اور اب جبکہ بچپن ختم ہوا تب بھی اس کا مطالعہ کررہا ہوں۔**میر شاہ زمان' میرپور خاص**۔"زندہ زمین" اور "استنبول" کا آخری حصہ بے حد اچھا رہا۔ میری خواہش ہے آپ کشمیر کے بارے میں ایک نمبر اور نکالیں۔**تابندہ (؟)** آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے لیکن پہنچتا بہت دیر میں ہے۔ ○ ---جی ہاں! ہمارا بھی یہی خیال ہے۔**ایک محب وطن پاکستانی (؟)** بنگلور کے کوارٹر فائنل میں کپتان کی حکمت عملی' کھلاڑیوں کی جلد بازی اور ان کے کردار پر تنقید اور بحث و مباحثے شائد ساتویں ورلڈ کپ تک جاری رہیں گے۔ کسی نے ان پر سٹے کا الزام لگایا تو کبھی ان کے کردار پر اُنگلیاں اُٹھائی گئیں۔ ایک اردو اخبار نے مخلوط رقص میں چند محو پاکستانی کھلاڑیوں کی تصاویر بھی چھاپی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ورلڈ کپ کے نام پر ملک بھر میں ثقافتی میلہ کے نام پر ناچ گانوں کے پروگرامات ہوئے جو ٹی وی پر بھی دکھائے گئے۔ ان ناچ گانوں اور پوپ میلہ کے پروگرامات میں اسلامی ثقافت کی دھجیاں بکھیری گئیں اور قوم سوتی رہی لیکن جب کھلاڑیوں نے محفلیں سجائیں تو پوری قوم چیخ اُٹھی حالاں کہ میوزیکل پروگرام اور مخلوط ناچ گانے آج بھی اسکرین پر اسی زور و شور سے جاری ہیں۔ ہمیں بحیثیت ایک پاکستانی قوم اپنے قول و فعل کے تضاد کو درست کرنا چاہئے۔ جو بات غلط ہے اسے گھر کے اندر بھی غلط ثابت کرنا ہوگا اور اپنے اعمال کو درست ثابت کرنا ہوگا۔**محمد صدیق خان' میانوالی**۔آنکھ مچولی کا شرارت نمبر پڑھنے کا اتفاق ہوا اور یہ مجھے

بہت پسند آیا۔ ہمارا گاؤں بٹیاں ہے جو میانوالی بازار سے کوئی چار میل دور ہے۔ میں ہر مہینے آنکھ مچولی خریدنے اتنی دور جاتا ہوں۔ ○ --- آنکھ مچولی سے آپ کی محبت قابل دید ہے۔ **عائشہ اعجاز، کراچی۔** انعامی مقابلے کا کوپن بھیج رہی ہوں امید ہے ردی کی ٹوکری کے حوالے نہیں کریں گے۔ ○ --- عائشہ بی بی! کوپن سے ردی کی ٹوکری کو پرہیز ہے۔ **سیدہ طیبہ بانو، کراچی۔** آنکھ مچولی پہلی بار اس وقت لیا جب ہم ٹرین میں اسلام آباد سے کراچی اپنی نانی کے آرہے تھے۔ آنکھ مچولی ہمیں بے حد پسند آیا۔ اتفاق سے پی آئی بی میں جہاں آنکھ مچولی کا دفتر ہے۔ وہیں ہماری نانی کا گھر بھی ہے۔ **فوزیہ فیض، پنڈی بھٹیاں۔** آپ فنکاروں اور سیاست دانوں کے انٹرویوز کیوں شائع نہیں کرتے؟ ○ --- بی بی! آنکھ مچولی بچوں کا رسالہ ہے اس کا فنکاری یا سیاست سے کیا تعلق اور ہم ایسے لوگوں کے انٹرویو بھلا کیسے چھاپ سکتے ہیں جنہیں عوام سے نہیں صرف پیسے یا اپنے مفادات سے محبت ہوتی ہے۔ **عین نورانی، پسنی (بلوچستان)** آنکھ مچولی میں دلچسپ اور معیاری تحریریں ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ **محمد صفدر اقبال بابو، ملکوال۔** اس دفعہ ہر تحریر بے حد دلچسپ لگی۔ ماہ رواں کی پہلی بات بھی خوب رہی۔ **بازیز رمضان، پسنی (بلوچستان)** تازہ شمارہ اتنا اچھا تھا کہ بیان نہیں کرسکتا، کہانیاں تمام پسند آئیں۔ **مس سپر دھماکہ، کوئٹہ۔** شمارہ دیر سے ملا، ماہ رواں کی پہلی بات دل کو لگی۔ آپ نے ہمارا پچھلا خط نہیں چھاپا چلیں کوئی بات نہیں ہم نے آپ کو معاف کیا۔ ○ --- بی بی! کوئٹہ تو بڑے پُرامن لوگوں کا شہر ہے دھماکے تو کراچی میں ہوتے ہیں شاید آپ نے اپنا آنکھ مچولی میں خط چھپوانے کے لئے یہ سپر دھماکہ کیا ہے!! **مزمل، عبدالرحمٰن کراچی۔** سائنسی مضامین کم چھپ رہے ہیں، تعداد بڑھائیے، کوئی قسط وار ناول شروع کیجئے، میجر مست گل کا انٹرویو شائع کیجئے اور ہاں قیمت کچھ کم کیجئے ..... پلیز! **محمد حسن عارف، کراچی۔** پرچہ دیر سے ملنے لگا ہے جس کی وجہ سے مقابلوں میں شامل نہیں ہوسکتے۔ ○ --- لیکن ہم نے تو انعامی مقابلوں کی تاریخ بھی تو بڑھادی ہے۔ **ثمرین، ناز، واہ کینٹ۔** آنکھ مچولی کی ہر تحریر مجھے اچھی لگتی ہے۔ واقعی یہ ایک منفرد رسالہ ہے یہ میرا پہلا خط ہے پلیز دو لائنیں ہی چھاپ دیجئے ہم اس ہی پر گزارہ کرلیں گے ○ --- جلدی سے مٹھائی کھلائیے آپ کی دو لائنیں چھپ گئی ہیں۔ **ثروت سلیم، کراچی۔** آپ نے پہلے بھی میرے لطائف چھاپے تھے اس بار بھی ---- ○ --- بی بی! آپ کے بھیجے ہوئے لطائف تو ردی کی ٹوکری کو پسند آگئے کچھ آنکھ مچولی کی پسند کے لطائف بھی بھیجئے ناں! **راجہ مختار حسین، کراچی۔** آنکھ مچولی میں چھپنے والی خوبصورت نظموں اور دلچسپ و معیاری کہانیوں کو کتابی صورت میں شائع کیجئے۔ ○ --- آپ کی ہی نہیں یہ کئی ساتھیوں کی خواہش ہے، آنکھ مچولی عنقریب ہی ایک پر تجسس، حیرت انگیز اور دلچسپ قسط وار ناول کو کتابی صورت میں شائع کرنا کا ارادہ رکھتا ہے۔ جسے آنکھ مچولی کے قارئین نے بے حد پسند کیا تھا۔

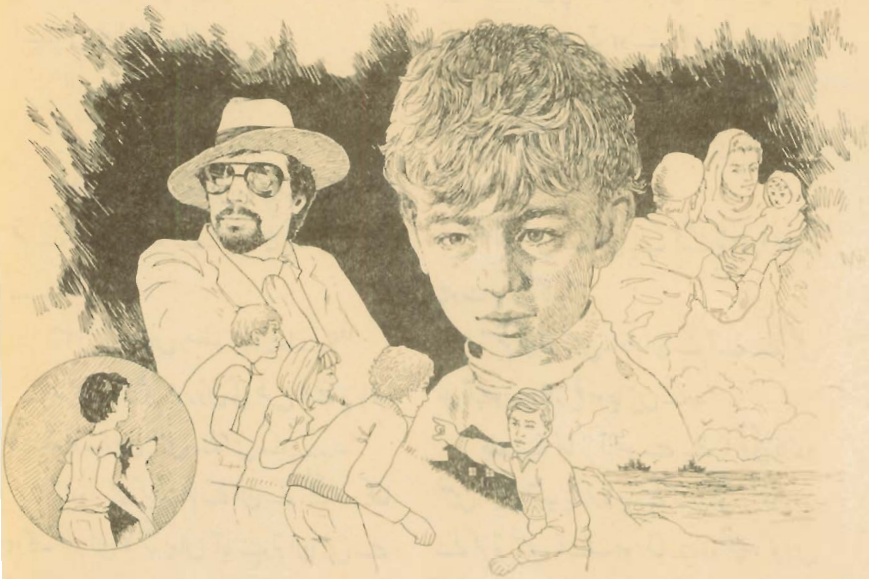

ننھا قیدی

کہانی: نصیر الدین حیدر انتخاب: لعل بخش

ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔

عاصمہ سمندر کے کنارے اکیلی کھیل رہی تھی کہ کھیلتے کھیلتے حویلی کی اس جانب چلی گئی جہاں شمالی حصّے کے ٹوٹے پھوٹے کمرے کے قریب ایک غار تھا۔

ابھی وہ غار سے چند قدم کے فاصلے پر تھی کہ اس نے بانو کے بیٹے کو اپنے کُتّے کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس نے لڑکے سے کوئی بات کرنے کے بجائے اُلٹے قدموں دوڑ لگا دی۔ وہ سیدھی اپنے بہن بھائیوں کے پاس پہنچی اور ہانپتے ہوئے بولی "بھائی جان! وہاں ...... وہ ...... وہ ......"

بڑے بھائی زاہد نے جلدی سے پوچھا "وہ کون؟ پوری بات کرو۔"

"وہ ...... وہ کیا نام ہے اس کا ...."

عاصمہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے پوری

بات نہیں نکل رہی تھی۔ حامد نے اسے پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا اور بولا :

"اب بتاؤ؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"وہ بانو ہے نا....؟"

"ہاں ہاں۔ اپنی نوکرانی۔" زاہد نے کہا "کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟" "نہیں۔ میں نے ....."

"اس کے میاں رمضو کو دیکھا ہے؟"

عاصمہ بوڑھی عورتوں کی طرح ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی "میں نے اس کے ....."

"اوہ! سمجھ گیا۔ تم نے ان کے کُتّے کو دیکھا ہوگا۔ اگر ان کا کُتّا یہاں آیا ہے تو ان میں سے بھی کوئی نہ کوئی ضرور آیا ہوگا۔"

عاصمہ غصّے سے بولی "کُتّے کو اور بانو کے بیٹے آچھو' دونوں کو دیکھا ہے۔ وہ ٹوٹے ہوئے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔"

زاہد' زاہدہ اور حامد تینوں سوچ میں پڑ گئے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد زاہد نے کہا "تم تینوں یہیں پر ٹھہرو۔ میں جا کر پتا کرتا ہوں کہ آچھو کس غرض سے وہاں کھڑا ہے۔"

حامد بولا "کیا میرا آپ کے ساتھ چلنا مناسب نہیں؟"

"اچھا تم آسکتے ہو۔"

زاہد اور حامد اسی وقت، سمندر کے کنارے کی طرف چل پڑے۔ زاہد کی اسکیم تھی کہ وہ کنارے سے ہوتے ہوئے آچھو کے پاس پہنچ جائیں اور پھر باتوں باتوں میں اس سے اس کے آنے کا منشا دریافت کریں۔ لیکن حامد نے کہا :

"اگر اس کے ماں باپ آگئے تو ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

"تم گھبراؤ نہیں۔ ہم ان کے آنے سے قبل ہی آچھو سے فارغ ہو جائیں گے۔"

حامد نے کہا "آچھو سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہمیں تو یہ پتا کرنا چاہئے کہ یہ لوگ کوئی بچہ لے کر تو نہیں آئے۔ ہو سکتا ہے وہ آچھو کو اس کی نگرانی کرنے کے لئے چھوڑ گئے ہوں۔"

وہ لوگ اکثر منوڑا آتے رہتے تھے یہاں ان کے دادا مرحوم کی ایک پُرانی حویلی تھی۔ بانو اور رمضو ان کے ملازم تھے جن پر انہیں شک تھا کہ وہ بچوں کو اغوا کرنے والوں کے لئے کام کرتے ہیں۔

زاہد نے غور سے حامد کی طرف دیکھا اور بولا "تمہارا خیال دُرست معلوم ہوتا ہے۔ اگر آچھو بچے کی نگرانی کر رہا ہے تو ہمیں پہلے اس بچے کو قید سے نجات دلانی ہوگی۔"

تو پھر اس کا ایک طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟" زاہد نے پوچھا۔

"تم آچھو کو باتوں میں لگاؤ۔ میں غار میں جا کر پتا کرتا ہوں کہ وہاں کوئی بچہ قید ہے یا نہیں۔"

یہ کہہ کر زاہد آگے بڑھا لیکن رک گیا۔ اس نے حامد سے کہا۔ "ایک اور بات کا خیال آیا ہے؟"

"کس بات کا؟" حامد نے پوچھا۔

"آچھو کے پاس ان کا کتا بھی ہے۔ اگر کتے نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ بھانڈا پھوڑ دے گا۔ تو پھر تم کتے اور آچھو کو لے کر غار سے کچھ ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ تاکہ کتا مجھے نہ دیکھ سکے۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر زاہد آچھو کی طرف بڑھ گیا اور حامد آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

آچھو کے نزدیک پہنچ کر زاہد ایک دم بولا "آخاہ' آچھو! منوڑا کیسے آنا ہوا؟ کیا رمضو بھی آیا ہے؟"

آچھو زاہد کو دیکھ کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے زاہد کی جانب دیکھا تو زاہد بولا :

"کیوں؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔"

"ابو آئے ہیں۔ کہیں گئے ہیں' اور مجھے یہاں پر رُکنے کے لئے کہہ گئے ہیں؟"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ رمضو نے تمہیں یہاں کیوں رُکنے کو کہا؟ وہ تمہیں ہمارے پاس نہیں لے آیا؟ اس کو تو ہمارا پتا ہے۔"

آچھو کی پریشانی اس کے چہرے سے ظاہر تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ زاہد کو کیا جواب دے۔

زاہد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے باتیں بھی شروع کر دیں "چلو چھوڑو' اس بات کو۔ شاید کام سے فارغ ہونے کے بعد رمضو تمہیں ہمارے پاس لاتا۔ آؤ' ذرا سمندر کے کنارے زاہدہ اور عاصمہ کو دیکھتے ہیں۔ وہ وہاں کھیلنے گئی ہیں۔"

"نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اگر میں یہاں سے چلا گیا تو ابو پریشان ہوں گے۔"

"واہ' اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے؟ ہمیں کہیں دور تو نہیں جانا۔"

آچھو جانا تو نہیں چاہتا تھا' مگر مجبور تھا۔ وہ زاہد کی بات کو ٹال نہ سکا اور اپنے کتے کو لے کر سمندر کی طرف چلنے لگا۔ زاہد نے چور آنکھوں سے حامد کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً" غار کی جانب دوڑا' اور پلک جھپکتے میں اس کے اندر داخل ہو گیا۔

زاہد نے آچھو سے کہا "نہ جانے یہ دونوں

کہاں غائب ہوگئی ہیں۔ ایک گھنٹے سے انہیں تلاش کررہا ہوں۔ حامد بھی ڈھونڈ رہا ہے۔"

زاہد نے اس انداز سے آچھو سے باتیں کیں کہ اسے یقین ہوگیا کہ وہ سچ مچ اپنی بہنوں کی تلاش میں ہے۔ مگر وہ اب بھی کچھ بے چین سا تھا' کیوں کہ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ اپنے ابو کے ساتھ منوڑا آیا ہے۔ حالانکہ وہ آچھو کو بچے کی نگرانی پر چھوڑ کر خود واپس کراچی چلے گئے تھے اور شام کو ان کے آنے کا پروگرام تھا۔

حامد جلد ہی فارغ ہوگیا اور اپنے آپ کو آچھو کی نظروں سے بچاتا ہوا سمندر کے ساحل پر پہنچ گیا۔ زاہد نے حامد کو دیکھ کر کہا "اچھا آچھو' میں چلتا ہوں۔ شاید وہ گھر پہنچ چکے ہوں۔ رمضو آجائے تو تم اسے لے کر ہمارے پاس ضرور آنا۔ سمجھے؟"

آچھو نے سرہلادیا۔

زاہد کے جاتے ہی آچھو غار والے کمرے کے نزدیک جا کر کھڑا ہوگیا۔ زاہد نے بھی تیز تیز قدم اُٹھائے اور حامد کو جالیا۔ حامد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ زاہد کے پوچھنے پر اس نے کہا :

کمرے کے دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا' اس لئے اس میں داخل ہو کر کچھ دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس کمرے میں کوئی بچہ ہے ضرور۔"

"تم نے یہ کیسے اندازہ کیا؟"

"میں نے سسکیوں کی آواز سُنی تھی۔"

"اف میرے اللہ! یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے۔ ہمیں اس کی ضرور مدد کرنی چاہئے۔ اگر شام ہونے سے پہلے ہم نے اس کو وہاں سے نہ نکالا تو وہ اسے آکر لے جائیں گے۔"

"میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ بانو اور رمضو اس بچے کو یہاں چھوڑ گئے ہیں' اور اپنے بیٹے آچھو کو نگرانی کے لئے یہاں رہنے دیا ہے۔ اب وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر شام کو آئیں گے۔"

"تم دُرست کہتے ہو۔ چلو آؤ' زاہدہ اور عاصمہ کو بھی اپنے ساتھ لے لیں۔"

"مگر کرنا کیا ہے؟"

زاہد جلدی سے بولا "ان ظالموں سے وہی برتاؤ کریں گے جو یہ دوسروں سے کرتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم رمضو اور بانو کے بیٹے کو کمرے میں قید کر کے اس بچے کو نکال کر لے جائیں گے۔"

"مگر اس کو رکھیں گے کہاں؟"

رکھنا کہاں ہے۔ سیدھے کراچی جائیں گے اور اسے پولیس کے حوالے کردیں گے۔

"کیا پولیس کو پوری بات بتانا ہوگی؟"

"یہ ہم راستے میں سوچیں گے۔ اس وقت

باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی کرو۔"

دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ گامو کھانا پکانے کی تیاری کر رہا تھا۔ زاہدہ اور عاصمہ بے کار بیٹھی تھیں۔

زاہد نے لڑکیوں کو اُٹھنے کا اشارہ کیا تو گامو نے دیکھ لیا۔ اس نے کہا "اب میں کھانا تیار کرنے لگا ہوں' اور تم لوگ باہر جا رہے ہو۔ اگر کہیں جانا ہے تو کھانا کھا کے جانا۔"

"ہمارا کھانا نہ ہی تیار کرو تو اچھا ہے۔" زاہد نے کہا۔

گامو نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں؟ کیا کہیں دعوت پر جانا ہے؟"

"ہاں۔ آج ہمیں ایک بہت بڑی دعوت میں جانا ہے۔" یہ کہہ کر زاہد بچوں کو لے کر باہر نکل گیا۔

چاروں بچوں نے آچھو کو جا کر گھیر لیا۔ ان کے ساتھ ٹامی بھی تھا۔ زاہد نے آچھو کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "آؤ آچھو' تمہیں ایک نئی چیز دکھائیں۔" اور پھر اسے گھسیٹتا ہوا غار کے پاس لے گیا۔

آچھو نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا "یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ مجھے تو اس غار سے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈرو نہیں۔ یہ تو تمہارا اپنا گھر ہے۔" زاہد نے کہا اور آچھو کو زبردستی غار کے اندر لے گیا۔ تینوں بچے' ٹامی' اور آچھو کا کتا ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

کمرے کے نزدیک لے جا کر زاہد نے آچھو کو گھورتے ہوئے کہا :

"اس کمرے کی چابی تمہارے پاس ہے؟"

آچھو نے ان جان بنتے ہوئے کہا "کیسی چابی؟"

"ہم ساری بات جان چکے ہیں۔ تم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ مل کر اس کمرے میں ایک بچے کو قید کر رکھا ہے۔ اگر تم نے ہمیں چابی نہ دی تو ہم تمہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

آچھو گھبرا گیا۔ اس نے اسی وقت چابی نکال کر زاہد کے حوالے کر دی' اور ساتھ ہی روہانسی آواز میں بولا "صاحب جی' اس میں میرا کوئی قصور نہیں' آپ چابی لے لیں اور مجھے چھوڑ دیں۔"

"ہم بچے کو نکال کر تمہیں چھوڑ دیں گے۔" زاہد نے کہا۔

آچھو مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے تینوں بچے کھڑے تھے۔ زاہد تالا کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک تین

سال کا بچہ زمین پڑا سو رہا تھا۔ زاہد نے آگے بڑھ کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی دکھائی دیں۔ اس نے بچے کو اُٹھالیا تو وہ جاگ گیا اور جاگتے ہی رونا شروع کردیا۔ زاہد اس کو باہر لے آیا۔

باہر آکر اس نے حامد اور زاہدہ کو اشارہ کیا تو انہوں نے آچھو کو دھکا دے کر کمرے کے اندر پھینک دیا۔ اور کُنڈی چڑھا کر باہر سے تالا لگا دیا۔

بچہ برابر روئے جارہا تھا۔ لیکن جب وہ اسے لے کر غار سے باہر آئے تو وہ چپ ہوگیا۔ زاہدہ نے بچہ زاہد کی گود سے لے لیا اور اسے یوں پیار کیا جیسے عورتیں بچوں کو کرتی ہیں۔ عاصمہ نے توحد کردی۔ اس نے اُچک کر بچے کا منہ چُوم لیا۔ حامد نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ایک ننھے قیدی کو ظالموں کے پنجے سے رہائی دلا کر چاروں کو بے حد خوشی ہوئی تھی۔

زاہد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "نہ جانے ایسے کتنے بچے ان ظالموں نے اغوا کیے ہوں گے۔"

"اب ہمیں جلد از جلد کراچی چلنا چاہئے تاکہ اسے تھانے میں پہنچا دیا جائے۔ ممکن ہے اس کے ماں باپ نے تمام تھانوں میں اطلاع کردی ہو۔"

ضرور کردی ہوگی۔ یہ بچہ معمولی گھر کا دکھائی نہیں دیتا۔ کسی امیر آدمی کا دکھائی دیتا ہے۔"

"آپ نے کیسے اندازہ کیا؟" عاصمہ نے پوچھا۔

زاہد نے جواب دیا۔ "اس کے کپڑے اس کی حالت کا پتا بتا رہے ہیں۔ چلو' اب باقی باتیں اسٹیمر میں بیٹھ کر کریں گے۔"

آچھو کا کتا اور ٹامی ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے' کیوں کہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ کئی دنوں کے بعد دونوں ملے تھے۔ اس لئے خوب کھیلے کودے۔ جب ٹامی نے بچوں کو جاتے ہوئے دیکھا تو اس نے بھی ان کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ لیکن آچھو کا کتا اس کے ساتھ نہ گیا۔ وہ پہلے تو ان سب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا' اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تو وہ غار کی جانب بھاگ گیا۔

بچے ساحل پر پہنچے تو ایک اسٹیمر کراچی جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ وہ اس میں سوار ہوگئے۔ زاہد نے دوسرے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا :

"ہم تھانے والوں کو یہ بات ہرگز نہیں بتائیں گے کہ ہم نے اسے ان بدمعاشوں کے قبضے سے چھڑایا ہے' بلکہ یہ کہیں گے کہ یہ سمندر کے کنارے بیٹھا رو رہا تھا۔"

گھر پہنچنے سے پہلے بچے تھانے گئے۔ جوں ہی وہ تھانے میں داخل ہوئے' ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پانچ چھ پولیس والے زاہد کی طرف بڑھے اور اس سے بچہ لے لیا۔ زاہد اور دوسرے بچے بٹر بٹر ان کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں.....

تھانے دار آیا اور اس نے سپاہیوں سے پوچھا "یہ کس کا بچہ ہے؟"

ایک سپاہی نے کہا "سیٹھ صالح بھائی کا بچہ ہے۔ یہ دیکھئے اس کی فوٹو' جو سیٹھ صاحب ہمیں دے گئے تھے۔"

"مگر اسے لایا کون ہے؟" تھانے دار کی اس بات پر سب لوگ بچوں کی طرف دیکھنے لگے۔ جس سپاہی نے بچے کو اُٹھا رکھا تھا' وہ بولا : "یہ بچے لائے ہیں۔"

"شاباش! شاباش! سیٹھ صالح بھائی نے اس کا کھوج لگانے والے کو بیس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔ تمہیں یہ ملا کہاں سے؟"

"جی' میں آپ کو بتاؤں' تھانے دار صاحب؟" عاصمہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

زاہد نے اسے پیچھے گھسیٹ لیا اور خود تھانے دار سے بولا "میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ہمیں یہ بچہ سمندر کے کنارے ملا تھا اور رو رہا تھا۔ جب ہم نے اس سے گھر کا پتا پوچھا تو اس نے کچھ نہ بتایا۔ ہم اسے لے کر تھانے آ گئے۔"

"شاباش! تم نے بہت اچھا کیا' جو اسے تھانے لے آئے۔" تھانے دار نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا' اور کسی کو ٹیلی فون کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد تھانے کے سامنے ایک کار آ کر رُکی۔ کار میں سے تین مرد اور دو عورتیں اتریں۔ ایک عورت نے بچے کو دیکھتے ہوئے شور مچانا شروع کر دیا "میرا بلّو' میرا بیٹا اسے کون لایا ہے؟"

زاہد نے ہنستے ہوئے کہا "باجی اسے ہم لائے ہیں۔"

"میں بھی ان کے ساتھ تھی۔" عاصمہ نے زاہد کے پیچھے سے سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"شاباش! جیتے رہو! تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ ہم تمہیں انعام دیں گے۔"

تھانے دار سیٹھ صاحب سے بولا "یہ بچے واقعی شاباشی کے قابل ہیں۔ اگر آپ کا یہ بچہ کسی بدمعاش کے ہتھے چڑھ جاتا تو مشکل ہی سے ملتا۔"

سیٹھ نے زاہد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ایسا نہ کہئے' تھانے دار صاحب۔ ایسا نہ کہیے ۔ اگر یہ بچہ ہمیں نہ ملتا تو ہم جیتے جی مر جاتے۔"

"آپ ان بچوں کو ابھی' اسی وقت انعام دیں۔" سیٹھ کی بیوی نے کہا۔

"ضرور ضرور۔" یہ کہتے ہوئے سیٹھ نے جیب میں ہاتھ ڈالا چیک بک نکال کر بیس ہزار روپے کا چیک کاٹا اور زاہد کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "لو بیٹا' یہ تمہاری نیکی کا صلہ ہے۔"

زاہد نے مُسکراتے ہوئے چیک لے لیا اور پھر اسے تھانے دار کو دیتے ہوئے بولا :

"تھانے دار صاحب' اسے سنبھال کر رکھ لیجئے۔" "کیوں؟" تھانے دار نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا' اور اس میں آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ اس انعام پر کس کا حق ہے۔ اب آپ ہمیں اجازت دیں۔" یہ کہتے ہوئے زاہد جانے لگا۔

تھانے دار نے اسے روکتے ہوئے کہا "بیٹا' تم نے تو مجھے شش و پنج میں ڈال دیا ہے۔ اپنا پتا تو بتاتے جاؤ۔"

سیٹھ صاحب نے بھی اپنی جیب سے نوٹ بک نکال لی تاکہ ایسے ہونہار بچوں کا پتا نوٹ کر سکیں۔

زاہد نے اپنے باپ کا نام بتایا تو سب لوگ حیران رہ گئے۔ زاہد کے ابا کو کون نہیں جانتا تھا۔ تھانے دار نے پتا لکھ لیا تو بولا :

"میں تمہارے والد صاحب سے ضرور ملوں گا۔"

سیٹھ نے زاہد کے ابو کی تعریف کرتے ہوئے کہا "جیسا باپ فرض شناس اور نیک انسان ہے ویسی ہی اس کی اولاد بھی ہے۔"

زاہد نے حامد کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ لوگ حامد کے ابا کو بھی جانتے تھے۔ انہوں نے ان کی بھی تعریف کی۔ اس کے بعد چاروں بچوں نے سب لوگوں کو سلام کیا اور ان کی دُعائیں لیتے ہوئے باہر نکل آئے۔ چلتے ہوئے' زاہد نے تھانے دار سے کہا :

"تھانے دار صاحب' آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔"

تھانے سے تھوڑی ہی دور زاہد کے ابا کی کوٹھی تھی۔ بچے باتیں کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ چاروں بے حد خوش تھے۔ انعام کے بارے میں زاہد نے جو کچھ کیا تھا' اس سے حامد اور زاہد کو تو پورا پورا اتفاق تھا مگر عاصمہ بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا :

"واہ بھائی جان! آپ نے بھی کمال کر دیا۔ کم از کم مجھے ایک گڑیا ہی لے دیتے۔"

زاہد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "عاصمہ صاحبہ' کیوں گھبراتی ہیں۔ پچاس گڑیاں لے کر دوں گا۔ لیکن آپ کو ایک کام کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟" عاصمہ نے پوچھا۔

"جب ہم گھر پہنچیں تو آپ رمضو کی گود چڑھ جائیں۔ اسے ایسا ستائیں کہ وہ تنگ آجائے اس پر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ اور زاہدہ تم بانو کے پاس چلی جانا اور رات گئے تک اس سے جُدا نہ ہونا۔"

"مگر بھائی جان' ان باتوں سے فائدہ کیا؟"

بہت فائدہ ہوگا۔" زاہد نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

حامد نے پوچھا "آپ بات تو پوری بتائیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ جس طرح بانو اور رمضو نے نہ جانے کتنے باپوں اور ماؤں کو پریشان کیا ہے' اسی طرح یہ بھی پریشان ہوں۔ انہیں بھی پتا چلے کہ اولاد کے گُم ہوجانے پر ماں باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ تم نے تھانے میں بچے کے ماں باپ کو دیکھا تھا کیسے مُرجھائے ہوئے چہرے تھے ان کے۔ مگر بچے کو پاکر گُلاب کے پھول کی طرح کِھل اُٹھے۔"

"مگر بھیا' آپ اتنی ہی کارروائی کریں گے؟"

"نہیں۔ تم دیکھتے جاؤ۔ میں ان سے کیا برتاؤ کرتا ہوں۔" زاہد نے عاصمہ اور زاہدہ کو سمجھاتے ہوئے کہا "تم دونوں بانو اور رمضو کا پیچھا نہ چھوڑنا۔ رہتے تو یہ کوٹھی میں ہیں۔ باہر جائیں گے تو ہمارے کہنے پر جائیں گے۔"

"بھائی جان' آپ ابو سے کہہ کر ان کو روک لیں۔ اس طرح وہ باہر نہ جاسکیں گے۔" عاصمہ نے کہا۔

"ایسا میں چاہتا تو نہیں' خیر یہ بھی کر دیکھوں گا۔"

کوٹھی آگئی تھی۔ چاروں خاموشی سے کوٹھی کے اندر داخل ہوگئے۔

شام کو زاہد کے ابا گھر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ منوڑا سے بچے آئے ہیں اور ایک دو دن گھر رہنے کے بعد دوبارہ منوڑا چلے جائیں گے۔

حامد ماں باپ سے ملنے اپنے گھر چلا گیا۔ جاتے ہوئے زاہد سے وعدہ کر گیا تھا کہ وہ دوسرے دن شام کو ضرور ان کے ہاں پہنچ جائے گا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بانو اور رمضو باہر جانے کے لئے پر تولنے لگے۔ وہ ہمیشہ گھر والوں کو کھانا کھلانے کے بعد منوڑا جایا کرتے تھے۔ کبھی دونوں میاں بیوی' کبھی رمضو اکیلا اور کبھی بانو اور اس کا بیٹا آچھو۔ زاہد ان کی نیت بھانپ گیا۔ اس نے فوراً" زاہدہ اور عاصمہ کو اشارہ کیا۔ زاہدہ اٹھ کر بانو سے لپٹ گئی اور بولی :

"میں تو آج بانو سے کہانی سنوں گی۔"

عاصمہ رمضو سے لپٹتے ہوئے بولی۔ "میں رمضو سے کہانی سنوں گی۔"

دونوں میاں بیوی گھبرا گئے۔ وہ تو باہر جانے کی سوچ رہے تھے۔

رمضو نے ٹالتے ہوئے کہا "آج نہیں۔ کل ایک مزے دار کہانی سُناؤں گا۔"

زاہد نے کہا "آج کتنے دنوں کے بعد تو ہم گھر آئے ہیں۔ آج سنا دو گے تو کیا ہو جائے گا۔"

بانو بولی "آج میرے سر میں سخت درد ہے' اس لئے میں کہانی نہ سنا سکوں گی۔"

"واہ! تم دونوں میاں بیوی کو آج ہی بہانے گھڑنا تھے۔ مگر یہ دونوں آج نہیں چھوڑیں گی۔ کہانی سُن کر رہیں گی۔" زاہد نے کہا۔

زاہدہ اور عاصمہ نے مچلتے ہوئے کہا "ہاں ہم تو کہانی سن کر رہیں گے' چاہے سر میں درد ہو یا پیٹ میں۔"

بیٹیوں کی ضد کو دیکھتے ہوئے ان کے ابا بولے "ان کی خاطر گھڑی دو گھڑی کی تکلیف سہہ لو گے تو کیا ہو جائے گا۔"

"یہ بات ہوئی نا۔ ان میں سے آج کوئی باہر نہ جائے گا تو آفت تھوڑی آجائے گی۔" زاہد بولا۔

"ٹھیک کہا میرے بیٹے نے۔ چلو' جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ آج تم میں سے کوئی بھی باہر نہیں جائے گا۔" زاہد کے ابا نے حکم دیا۔

دونوں میاں بیوی کے ارادوں پر اوس پڑ گئی۔ ان کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

آخر وہ بڑے مرے دِل سے اُٹھے اور عاصمہ اور زاہدہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے زاہد دل میں بہت ہنسا۔

رات کے نو بجے عاصمہ کی آواز سنائی دی

"ابو جان!"

"کیا ہے بیٹی؟" عاصمہ کے ابا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں' ابا جان۔" عاصمہ نے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" زاہد کے ابا نے کہا۔

"بات کیا ہونی ہے۔ رمضو عاصمہ کو کہانی سنانا نہیں چاہتا ہو گا۔" زاہد بولا۔

"ہاں۔ یہی بات ہو گی۔ بڑی سمجھ داری کی باتیں کرتے ہو۔"

اس پر زاہد مُسکرایا۔ امی نے اس سے کہا "بیٹا اب سو جاؤ جا کر۔"

"نہیں امی جان۔ جب تک زاہدہ اور عاصمہ کہانی نہ سُن لیں گی' میں ہرگز نہیں سوؤں گا۔"

"تم نے شرط باندھ رکھی ہے؟" امی بولیں۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے' امی جان۔"

زاہد کی اس بات پر اس کے ابا نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ اس پر زاہد نے کہا "آپ میری فکر نہ کریں۔ آپ سوجائیں۔"

"مگر بیٹا' اس میں ضد والی کون سی بات ہے؟" زاہد کے ابا نے کہا۔

"کوئی بات نہیں' ابا جان۔ آپ میری فکر نہ کریں یہ کوئی ضد والی بات نہیں۔ بلکہ میں خود بھی کہانی سُننے بانو اور رمضو کے پاس جارہا ہوں۔"

"یہ بُری بات ہے' بیٹا۔ ان کو بھی اب آرام کرنا چاہیئے۔ بے چارے سارا دن کام کرتے رہتے ہیں۔" زاہد کے ابا نے کہا۔

"ہماری خاطر ایک دن تکلیف اٹھالیں گے تو کیا ہوجائے گا؟"

امی نے کہا "زاہد ٹھیک کہتا ہے۔ انہوں نے ہی تو ان کو کہانیاں سُننے کی عادت ڈالی ہے۔ اب بچے ضد کرنے لگے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔"

زاہد کے ابا مُسکرا کر خاموش ہورہے۔ زاہد اٹھ کر زاہدہ اور عاصمہ کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں میاں بیوی سخت پریشان ہیں۔ بات کرتے ہوئے اُلجھن سی محسوس کررہے ہیں۔

بچوں نے دونوں کو خوب قابو میں کر رکھا تھا۔ زاہدہ بانو کو پکڑے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں بیٹھی تھی' اور عاصمہ رمضو کو لئے دوسرے کونے میں۔ دونوں ان کو کہانیاں سُنا رہے تھے۔

اچانک گھڑی نے گیارہ بجائے زاہد اُٹھ کر باہر گیا اور کوٹھی کے چوکیدار سے کہا کہ اس کے ابا کی سخت تاکید ہے کہ آج رات بانو یا رمضو کوٹھی سے باہر نہ جائیں۔

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو زاہدہ اور عاصمہ کو اپنے اپنے بستر پر لیٹے پایا۔ بانو اور رمضو اپنے کوارٹر میں جاچکے تھے۔

سونے سے پہلے زاہد نے زاہدہ سے کہا "مزہ جب ہے کہ صبح رمضو منوڑا نہ جاسکے۔"

"بھلا ہم اسے کیسے روک سکتے ہیں؟"

"ایک صورت ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں اسے لے کر حامد کے ہاں چلا جاؤں گا اور پھر ہم دونوں رمضو کو لے کر کلفٹن کی سیر کو چلے جائیں گے۔ اس طرح رمضو منوڑا نہ جاسکے گا۔"

شام کو تو ضرور جائے گا۔"

"ہاں۔ اسے شام ہی وہاں جانا چاہئے تاکہ ان کے دوسرے ساتھی بھی وہاں پہنچ جائیں۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر....." زاہد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "ایک بہت بڑا ڈراما ہوگا جسے ہر کوئی دیکھے گا۔"

زاہدہ چُپ رہی۔ اس کے بعد دونوں نے اللہ کا نام لیا اور سو گئے۔

صبح ہوئی تو بانو اور رمضو جلدی جلدی گھر کا کام کرنے لگے تاکہ ان میں سے ایک منوڑا پہنچ کر آپھو اور اس بچے کے بارے میں پتا کرے۔

زاہد ان کی بے چینی کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے اپنے ابو سے کہا کہ وہ دفتر جاتے ہوئے رمضو کو تاکید کر جائیں کہ وہ اسے حامد کے گھر لے جائے۔

ابو نے رمضو سے کہا کہ وہ کام سے فارغ ہو کر زاہد کو حامد کے ہاں لے جائے۔

رمضو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ زاہد بولا "نہیں۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ میرے ساتھ حامد کے ہاں ضرور ضرور جانا ہوگا۔"

رمضو نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ سر ہلایا اور کام میں مصروف ہوگیا۔

زاہد نے رمضو کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ برابر اس کے پیچھے لگا رہا۔ بانو اپنے میاں سے بھی زیادہ بے چین اور فکر مند تھی۔ وہ زاہد کی جانب دیکھتی تو فوراً نظریں جُھکا کر بڑبڑانے لگتی۔

زاہد کو خیال آیا کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے جانے کے بعد بانو کوئی بہانہ بنا کر منوڑا چلی جائے۔ زاہد دوڑا ہوا اندر گیا اور اپنی امی سے بولا "امی جان، میں رمضو کے ساتھ حامد کے گھر جارہا ہوں۔ آپ بانو کو کہیں نہ جانے دیں۔"

"کیوں؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت تو جیسا میں کہوں، ویسا کیجئے۔"

امی نے اسی وقت بانو کو تاکید کردی کہ وہ کام ختم کر کے باہر نہ جائے۔ بانو نے غصے سے زاہد کی طرف دیکھا مگر اس نے منہ پھیر لیا اور رمضو کو لے کر باہر نکل گیا۔

زاہد کو گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ چوکیدار نے اندر آکر بانو سے کہا کہ اسے کوئی بُلا رہا ہے۔ بانو نے حیران نظروں سے چوکیدار کی جانب دیکھا۔ زاہدہ کی امی بھی حیران ہوئیں۔ انہوں نے کہا "جاؤ، باہر جا کر دیکھو۔ کون ملنے آیا ہے۔"

"شاید رمضو کے گاؤں سے کوئی آیا ہوگا۔"

"وہ تو کوئی جنٹل مین ہے۔ چوکیدار نے کہا۔ بانو سمجھ گئی کہ ضرور کوئی منوڑا سے آیا ہے اس کا خیال دُرست نکلا۔ وہ انہی لوگوں کا ساتھی تھا جو اس بچے کو اُٹھا کر لائے تھے۔ اس نے ہنستے

ہوئے اس آدمی سے کہا "آؤ بھائی جان، رمضو باہر گیا ہوا ہے ابھی آجائے گا۔ آپ چل کر کوارٹر میں بیٹھیں۔" پھر اس نے چوکیدار سے کہا "یہ رمضو کے گاؤں سے آئے ہیں۔ بڑے زمیندار جی کے بیٹے ہیں۔"

بانو آدمی کو لے کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ اس نے کوارٹر میں داخل ہوتے ہی بانو سے کہا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ وہاں غار کے کمرے میں تالا پڑا ہے۔ اور اِدھر اُدھر کوئی بھی نہیں۔"

"غار کے اندر سے کوئی آواز آرہی تھی؟"

"نہیں۔ البتہ تمہارا کُتّا غار کے باہر گھوم رہا تھا۔" اس نے کہا۔

"آپھو اس کے ساتھ نہیں تھا؟" بانو نے پوچھا۔ "نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔"

بانو یہ سُن کر سخت پریشان ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس آدمی کو کیا جواب دے۔

"ہم نے رات تم لوگوں کا بڑا انتظار کیا۔"

"ہاں" تو چلے گئے اور مجھے تمہارا پتا کرنے کو کہہ گئے، اس لئے میں صبح ہوتے ہی ادھر چلا آیا۔"

"آپ غار میں گئے تھے؟"

"ہم لوگوں کا بار بار اُدھر جانا ٹھیک نہیں۔"

پریشانی کی وجہ سے بانو کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس کو چُپ دیکھ کر اس آدمی نے کہا "اچھا، میں جاتا ہوں۔ تم آج شام کو ضرور منوڑا آنا۔ تم نہ آسکو تو رمضو کو بھیج دینا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

بانو بے چینی سے اپنے خاوند کا انتظار کرنے لگی۔ کبھی اندر جاتی اور کبھی باہر آجاتی۔ شام ہونے کو آئی، مگر رمضو اور زاہد کا کوئی پتا نہ تھا۔

اتنے میں زاہد کے ابا کی کار کوٹھی کے اندر آکر رُکی۔ انہوں نے زاہد کے بارے میں پوچھا تو زاہد کی امی نے کہا کہ وہ حامد کے گھر گیا ہے۔ آتا ہی ہوگا وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ رمضو، زاہد اور حامد کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ان کو دیکھ کر بانو کی جان میں جان آئی۔ زاہد اس کی پریشانی بھانپ چکا تھا۔ اس نے کہا:

"کیا بات ہے بانو؟ بڑی پریشان دکھائی دیتی ہو؟"

بانو نے زاہد کوئی جواب نہ دیا اور رمضو کو لے کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ ان کے جانے کے بعد زاہد اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا۔ ان کے ہمراہ ان کے والد بھی تھے۔ جب رمضو اور بانو بہانے سے باہر چلے گئے تھے تو زاہد نے تمام واقعات سے اپنے باپ کو آگاہ کردیا تھا اور انہیں اپنے بچوں کی بہادری پر بہت

مصیبت

مصیبت موسم سرما کی بارش کی طرح ہوتی ہے جو انسانوں، پودوں اور جانوروں کو تکلیف دینے کے باوجود بھی پھول کھلاتی ہے۔

مرسلہ... محمد صابر، سکھر

خوشی ہوئی تھی۔

زاہد نے اسی تھانے دار سے ملاقات کی جس سے وہ پہلے مِل چکا تھا اور جس کے پاس بیس ہزار روپے کا چیک تھا۔

زاہد نے کہا "تھانے دار صاحب، میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

"ہاں بیٹا، تم نے یہ بات کہی تھی۔" تھانے دار نے کہا اور جب وہ بیٹھ گئے تو زاہد نے اسے سارا واقعہ کہہ سُنایا اور پھر بولا :

"تھانے دار صاحب، اب آپ کو دیر نہیں کرنی چاہیے۔ فوراً وہاں جا کر بانو، رمضو اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیں۔ اگر آپ نے دیر کردی تو وہ لوگ فرار ہوجائیں گے۔"

"میں تو تیار ہوں۔ مگر آپ سب کو بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا تاکہ مجرموں کے ٹھکانے اور ان کی پہچان میں کسی قسم کی دِقت نہ ہو۔"

تھانے دار نے اسی وقت دس بارہ سپاہی اپنے ساتھ لیے اور زاہد کے ابا اور بچوں کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔ بچوں کے ساتھ ان کا کُتّا ٹامی بھی تھا۔

پولیس نے منوڑا پہنچتے ہی حویلی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس کے بعد تھانے دار چند سپاہیوں کے ہمراہ غار کی جانب بڑھا۔ اس وقت تمام بدمعاش غار کے اندر والے کمرے میں تھے اور آچھو سے باتیں کررہے تھے۔

زاہد پولیس کو لے کر بے دھڑک غار کے اندر داخل ہوگیا اور اس سے پہلے کہ بدمعاش ہوشیار ہو کر اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کرتے، پولیس نے انہیں گرفتار کرلیا۔ ان میں بدمعاشوں کا سردار، بانو، رمضو اور ان کا بیٹا آچھو بھی تھا۔ بانو اور رمضو کی شرم کے مارے آنکھیں اونچی نہیں ہورہی تھیں۔

دوسرے دن پورے ملک کے اخباروں میں بچّوں کے اس کارنامے کی خبریں شائع ہوئیں۔ اخباروں نے ان کی تصویریں بھی چھاپی تھیں اور لکھا تھا :

"ایسے بہادر اور نیک بچّوں پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک معصوم بچّے کو بدمعاشوں کے چنگل سے چھُڑایا اور انعام کی ساری رقم ایک خیراتی ہسپتال کو دے دی۔"

بُلند تر شرح منافع، بہترین خدمات اور سرمائے کا تحفّظ
- ایم سی بی ماہانہ خوشحالی اسکیم

ایم سی بی ماہانہ خوشحالی اسکیم میں سرمایہ کاری کرکے آپ نہ صرف ہر ماہ ۱۴٫۷۰ فیصد سالانہ کی شرح سے منافع حاصل کرسکتے ہیں بلکہ بینک کی طرف سے فراہم کردہ بے شمار دوسری سہولیات سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان سہولیات میں ملک بھر میں ۱۳۰۰ سے زائد برانچوں کی موجودگی اور دوستانہ ماحول میں ۱۴۰۰۰ ملازمین کا بھرپور تعاون شامل ہے۔ اور ساتھ ہی اس امر کا یقین بھی کہ ملک کے سب سے بڑے نجی بینک میں آپ کا سرمایہ بالکل محفوظ ہے۔

لہٰذا ایم سی بی ماہانہ خوشحالی اسکیم میں سرمایہ کاری کیجئے اور ہر ماہ گھر بیٹھے اپنے ضروری گھریلو اخراجات پورے کیجئے۔ نہ فکر کی ضرورت، نہ کوفت، نہ ملال۔

- منافع کی گھر پر وصولیابی
- ملک بھر میں ایم سی بی کی تمام برانچوں سے سہولیات دستیاب
- پُرکشش شرح منافع
- منافع کی بروقت ادائیگی

ماہانہ خوشحالی اسکیم

MCB
مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ
اچھی بینکاری بہترین بینکاری

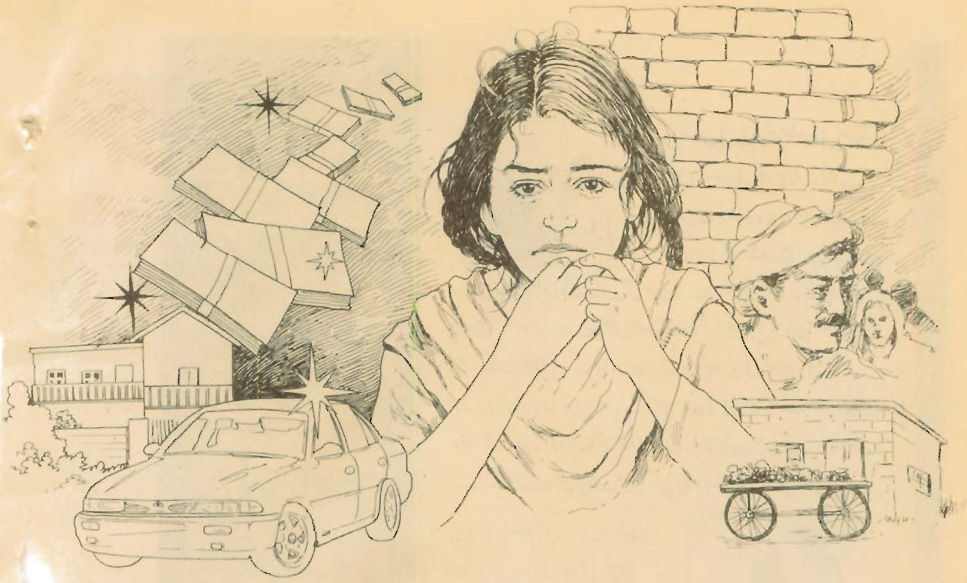

گمشدہ جنّت

شعاع نورین

سُرخ سفید، نیلی پیلی کالی، رنگ برنگی گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی اسے بالکل تتلیوں کی مانند لگتیں۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ ہمیشہ ان کی سمت دوڑتی کہ انہیں پکڑ لے، چھُو لے ..... اور جب اس کے ہم عمر بچے اپنی کاروں میں بیٹھے دیکھتی تو اور بھی بے چین ہو جاتی، اس کا دل چاہتا کاش! وہ بھی اس میں بیٹھ کر اُڑتی پھرے گلشن گلشن، صحرا صحرا ..... مگر وہ صرف حرکت کر سکتی تھی اس لئے کہ وہ ایک ریڑھی والے کی بیٹی تھی جو صبح سے شام تک اپنی ریڑھی میں سبزیاں بیچنے کے لئے گلی گلی، کوچے کوچے، کی خاک چھانتے ہیں جب کہیں جا کر شام کو اتنے سے پیسے ملتے ہیں کہ اپنے بچوں کا بمشکل پیٹ بھرتے ہیں، اور تن ..... وہ تو ہمیشہ بوسیدہ لباس کی کھڑکیوں سے جھانکتا رہتا ہے اور اپنی بے چارگی پر آنسو بہاتا رہتا ہے وہ اکثر

اپنے باپ کے ساتھ چلی جاتی جب وہ سبزی بیچنے گھر سے نکلتا..... رنگ برنگے پھولوں سے ڈھکے گھر، مخمل سی سبز گھاس کے لان اور ان کے چاروں طرف پھلواریاں والے خوبصورت بنگلے والے جب اس کے باپ سے سبزیاں خریدنے نکلتے تو وہ انہیں حسرت سے دیکھتی۔ کبھی ان کے میک اپ سے چمکتے چہرے، کبھی خوبصورت لباس، نت نئے جوتے، تو حسرت اور حیرت سے وہ پلک جھپکنا بھول جاتی اور اسے جب ہوش آتا جب اس کا باپ چیخ کر بلاتا، او نوری..... کہاں رہ گئی..... تب وہ بھاگ کر اپنے باپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی لیکن اس کی نگاہ پھر بھی روڈ کے دونوں جانب بنے ہوئے بنگلوں پر ہی ہوتی جن کے باہر رنگ برنگی کاریں کھڑی ہوتیں۔ یہ بھی انسان ہیں۔ اور ہم بھی..... اس کا ننھا سا ذہن سوچتا ہوا گھر پہنچتا..... پھر اس کا دل اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں ذرا بھی نہ لگتا۔ حالانکہ گھر میں شفیق ماں، بہن بھائی سب موجود ہوتے جو آپس میں پیار محبت سے رہتے تھے سب ایک کمرے میں سوتے، ایک پلیٹ میں کھاتے اور پھر سب مل کر ایک ساتھ کھیلتے کبھی آنکھ مچولی، کبھی اکڑ بکڑ..... اور پھر..... رات کو وہ اپنی ماں کی بانہوں میں مُنکھ سے سوجاتی لیکن باغی سوچیں کبھی کبھی اسے بہت دور لے جاتیں، ایک روز وہ شدید بخار میں تپ رہی تھی اور ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹائے سرداب رہی تھی قریب کھڑا باپ بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور تمام بہن بھائی بھی اسی پلنگ پر پریشان بیٹھے خدا سے اس کی صحت کے لئے دُعائیں مانگ رہے تھے۔ اس کی ماں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، اس کا بخار نارمل ہوگیا تھا اور اب وہ گہری نیند سو رہی تھی.....

کھٹ کھٹ..... کھٹ کھٹ۔ کھٹاک.....

کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا کہ نُوری نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا..... بابا"..... یہ کیا ..... یہ ..... وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی، یہ بکس تو بڑے بڑے آدمی کاروں والوں کے پاس ہوتا ہے..... تو کہاں سے لے آیا۔ وہ اس سے پوچھتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے بھاگی اور سبزی والا اچھی طرح دروازے کی کُنڈی لگا کر کوٹھری میں آگیا تھا..... جہاں وہ اس کا بابا..... اور اس کی ماں تھی..... "یہ تم کہاں سے لے آئے، کچھ تو بتاؤ!!؟" اس کی بیوی پوچھ رہی تھی..... "ہاں بابا..... جلدی بتا..... اور اس میں کیا ہے..... بابا" نوری بھی بہت بے چین تھی..... "صبر رکھ۔ صبر"..... اس کا سانس پھُول رہا تھا۔ سب بتائے دیتا ہوں۔ راجو نے اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا "اری نیک بخت میں روڈ پر جارہا تھا، وہاں دو کاروں میں

ایکسیڈنٹ ہوگیا' کاریں چُورا ہوگئیں اور کاروں والے ..... مرگئے یہ بریف کیس دور جاپڑا ..... کوئی آس پاس نہ تھا ..... بس میں اُٹھا لایا۔" "پیچھے پولیس ہے جو تیرا سانس پھول رہا ہے؟" راجو کی بیوی پوچھ رہی تھی "نہیں نیک بخت ..... وہ ایکسیڈنٹ ..... وہ تڑپتی لاشیں دیکھ کر کھوف زدہ ہورہا ہوں" وہ اب تک خوف زدہ ہورہا تھا۔ "تم بھی پاگل ہو' اب تم نے کوئی یہ ایکسیڈنٹ کیا ہے' خیر اب ان باتوں کو چھوڑو اور اس بکس کو کھولو" "..... یہ ایسے تو نہیں کُھلے گا' یہ تو چابی سے کُھلے گا یا پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنا پڑے گا۔" پھر گھنٹہ بھر توڑ پھوڑ کے بعد ..... سینکڑوں نوٹوں کی گڈیاں ہر طرف بکھر گئیں جو ایک ایک ہزار روپے کی تھیں "شاید کوئی کاروباری آدمی تھا....." "پندرہ بیس لاکھ روپیہ ہے" اس نے گڈیاں گن کر بیوی کو بتایا ..... "بس جی اسے کہتے ہیں اللہ کی رحمت جب برستی ہے تو چھپر پھاڑ کر برستی ہے کہ سنبھالی نہ جائے"

"نوری کے باپ ..... ہم نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں' اب ہم تو کیا..... ہماری اولادیں عیش کریں گی' بنگلے میں رہیں گے کار خریدیں گے اور نوابوں کی طرح رہیں گے" "ماں ..... تو یہ کیا کہہ رہی ہے ..... تو سچ کہہ رہی ہے ..... ہم ..... بنگلے میں رہیں گے ..... ہماری کار ہوگی' لال نہیں ..... ہری نا ..... پیلی ..... نہیں پیلی ..... نوری کا دل چاہا کہ ساری تتلیاں ایک دم اپنی پھٹی فراک میں قید کرلے وہ ان تتلیوں کے لئے کب سے ترس رہی تھی۔ بابا ماں سچ کہہ رہی ہے" وہ خوشی سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھ رہی تھی "ہاں ہاں..... بیٹا..... راجو نے پیار سے نوری کو بانہوں میں بھرلیا....."

پھر چند ہفتے میں انہوں نے وہ ایریا چھوڑ دیا اور نئی جگہ شفٹ ہوگئے۔ نیا بنگلہ ..... نئی کار ..... گھر مع خوبصورت فرنیچر..... رنگین ٹی وی' وی سی آر' فرج اور سب کچھ جو نُوری سوچتی تھی۔ وہ ہر چیز کو چھو کر دیکھتی اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آتا۔ پھر رات کو راجو گھنٹوں بیوی بچوں کو سمجھاتا کہ "اب ہم بڑے آدمی ہوگئے ہیں' بچوں تم اب مجھے بابا نہیں' ڈیڈی کہا کرو اور ماں کو ..... ممی ..... اور دیکھو اس بنگلے میں چھ سات کمرے ہیں' سب الگ الگ اپنے کمرے میں سویا کرو۔ اور جو کام بھی کروانا ہو اپنی ماں کو آواز نہ دینا میں نے جو نوکر رکھے ہیں باہر کا کام کرمُوں کرے گا اور گھر کا تمام کام ماسی کرے گی یہ رات کو بھی یہیں رہے گی اور اب ہر کام یہی کرے گی ..... اور دیکھو تم لوگ مل جل کر اب وہ آنکھ مچولی اور اکڑ بکڑ یہاں مت

کھیلنا ..... نہ آپس میں بیٹھ کر کہانیاں سُنانا۔ بلکہ الگ الگ کمرے میں بیٹھ کر رسالے پڑھنا' ٹیپ ریکارڈ سننا اور زیادہ دل گھبرائے تو وی سی آر پر کوئی فلم لگالینا ..... اور دیکھو مجھ سے کبھی کبھی ملاقات ہوا کرے گی کیونکہ میں جو اب کاروبار کروں گا تو صبح نو بجے کا گیا ہوا رات کو ایک ڈیڑھ بجے آیا کروں گا جب تک تم لوگ سو چکے ہوگے۔ پھر انشاء اللہ جمعہ کو اپنی ملاقات ہوا کرے گی' اور اب تمہاری ممی کو بھی تم سے بات کرنے کی فرصت کم ہی ملے گی کیونکہ اب جہاں ہم لوگ آگئے ہیں وہاں بہت بڑے بڑے لوگ رہتے ہیں یہاں ہر روز نئے نئے فنکشن ہوتے رہتے ہیں' وہاں جانا' وہاں کے لئے تحفے خریدنا' یوں روز تمہاری ممی کو بازار شاپنگ کو جانا پڑے گا' اور تقریبوں میں سے رات کو ایک ایک بجے واپس آنا ہوگا تو تم لوگ اپنے اپنے کمروں میں رہنا اور دل گھبرائے تو رسالے پڑھنا' وغیرہ وغیرہ ..... اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو آیا موجود ہے۔ طبیعت خراب ہو تو کرمُوں کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے یہاں چلے جانا وہ اچھے پیسے لے گا تو اچھی دوا بھی دے گا" مگر بابا ہمارا ایسے میں دل گھبرائے گا۔" نوری رو پڑی ..... میں نے کہا ناکہ ٹیپ سُننا' رسالے' اخبار' میگزین پڑھنا" بابا..... تو بار بار کیا کہہ رہا ہے پڑھنا... پڑھنا ہم ..... کو تو کتنا پڑھایا ہے ..... ہمیں تو الف ..... ب تک پتہ نہیں۔"

وہ روہانسی ہوگئی "اوہ! ارے میں تو بھول ہی گیا ..... خیر تم لوگ اب اتنے بڑے ہوگئے ہو کہ کے جی ..... نرسری میں تو داخل نہیں کروا سکتا' البتہ ٹیوشن کا انتظام کردوں گا ..... پھر انشاء اللہ تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ ....." ایک ہفتہ تک راجو بیوی بچوں کو ہی سبق پڑھاتا رہا پھر نیا معمول' نیا بنگلہ' نئی زندگی نئے طرز کے ساتھ چل پڑی ..... نوری اب نوری نہیں' نورین کہلاتی تھی ..... وہ ہر صبح ایک سے ایک خوبصورت لباس پہنتی' جب چاہتی تتلیوں کی طرح رنگ برنگی کار میں گھومتی' گھر میں اچھے سے اچھا کھانا پکتا ..... مگر..... اب نہ باپ کا پتہ تھا نہ ماں کا ..... نہ بھائی کا ..... نہ بہن کا ..... پورا گھر سائیں سائیں کرتا اسے جنگل سا لگتا۔ حالانکہ تمام کمرے فرنیچر سے آراستہ تھے ضرورت کی ہر چیز تھی۔ مگر اس گھر میں آواز نہ تھی۔ ہر شخص اپنے کام سے کمرے سے نکلتا اور واپس چلا جاتا..... اب نہ بابا تھا جو شام کو سبزی بیچ کر آتا تو سب بچوں کو اپنے پاس بٹھاتا۔ پیار کرتا' نوالہ ہر بچے کے منہ میں اپنے ہاتھ سے رکھتا نہ وہ اب ماں تھی جو ہر رات اپنے بچوں کو ایک ساتھ سُلاتی' کہانیاں سُناتی پیار سے تھپکتی ..... اور ممتا

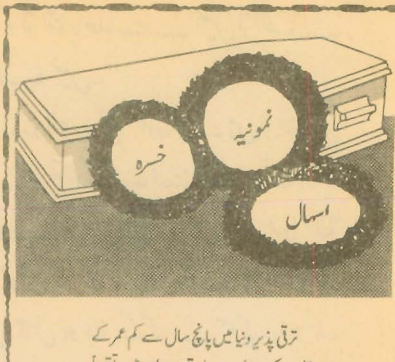

ترقی پذیر دنیا میں پانچ سال سے کم عمر کے
۳۵ ہزار بچے روزانہ مرجاتے ہیں ان میں تقریباً
۶۰ فیصد اموات صرف تین بیماریوں نمونیہ'
اسہال اور خسرہ سے ہوتی ہیں جن کا سستی تدابیر
سے علاج کیا جاسکتا ہے اور ان سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

ھرے سینے سے لگاتی۔ اب وہ بہن بھائی نہ تھے جو ساتھ آنکھ مچولی یا اکڑ بکڑ کھیلتے اور گھر میں خوب شور مچاتے اچھلتے کودتے اب تو ہر طرف سناٹا...... تنہائی ہے۔ اور محبت سے دوریاں ہیں محبت اور ممتا کے رشتوں میں مصروفیت اور یکٹ ویٹیز کی دیواریں ہیں" یہی سوچ کر نورین کو پھر بخار ہوگیا' اب وہ اکیلی اپنے بیڈ روم میں پڑی تھی آیا نے ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لادی تھی۔ ب دوا اس کو خود پینی تھی۔ نہ بابا پاس تھا نہ ماں قریب تھی کہ جس کے گھٹنے پر سر رکھ کر سوجائے ہ بہن بھائی اس کے بیڈ کے قریب تھے جو اس کے بخار اُترنے کی دُعائیں مانگے...... پہلے دُعاؤں سے بخار اُتر جاتا تھا۔ اب دواؤں سے بھی نہیں تر رہا...... یہ سوچ کر اس کی زور سے چیخ نکل گئی۔ نہیں نہیں بابا..... مجھے کار نہیں چاہیئے۔ مجھے بنگلہ نہیں چاہیئے۔ مجھے اپنا سبزی بیچنے والا بابا اچھا لگتا ہے جو مجھے روز اپنی بانہوں میں اُٹھاتا ہے۔ پیار کرتا ہے..... ماں کہیں پارٹیوں میں شریک نہیں ہوتی بلکہ گھر میں رہتی ہے ہمارے لئے کھانا پکاتی ہے رات کو اپنی ممتا بھری بانہوں میں سُلاتی ہے میرے بہن بھائی ایک ساتھ سوتے ہیں' مل کر آنکھ مچولی اکڑ بکڑ کھیلتے ہیں اودھم مچاتے ہیں' خوش رہتے ہیں' اور جب بیمار پڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دُعاؤں سے شفا دیتا ہے۔ مجھے وہی جنت چاہیئے محبت چاہیئے!!" وہ چیخ پڑی اور اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ ماں دوڑی ہوئی آئی' بابا دوڑا ہوا آیا' بھائی بہن دوڑے ہوئے آئے۔ "کیا ہوا ..... کیا ہوا ؟؟" سب کے لبوں پر ایک ہی سوال تھا۔ سب کے ہاتھوں کا لمس اس کے جسم کو چُھو رہا تھا۔ "ڈر گئی ہے ..... شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے؟" بابا کی آواز سُنائی دی۔ "ہاں بابا بہت ڈراؤنا خواب۔" وہ بڑبڑائی ماں نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔ "اب بھی ڈر لگ رہا ہے؟" ماں نے اسے بھینچتے ہوئے بڑی محبت سے پوچھا۔ "نہیں ماں!" وہ دھیرے سے بولی اور ماں باپ بھائی بہنوں کی جنّت میں گُم ہوگئی!!

مُسلمان کے مُسلمان پر حقوق

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"ایک مُسلمان کے دوسرے مُسلمان پر چھ حقوق ہیں"۔ پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا "جب تم مُسلمان بھائی سے ملو تو اُس کو سلام کرو، جب وہ دعوت دینے کے لئے مدعو کرے تو اُس کی دعوت قبول کرو، جب وہ تم سے نیک مشورے کا طالب ہو تو اُس کی خیر خواہی کرو اور نیک مشورہ دو، جب اُس کو چھینک آئے اور وہ الحمدللہ کہے تو اُس کے جواب میں یرحمک اللہ کہو، جب وہ بیمار پڑ جائے تو اُس کی عیادت کرو اور جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ"۔

(مسلم)

عطیہ اشتہار

حاجی فتح محمد میموریل آرگنائزیشن

۷، حسن لشکری اسٹریٹ، بادشاہی روڈ کراچی

۸۷، بلاک نمبر ۷، خانیوال

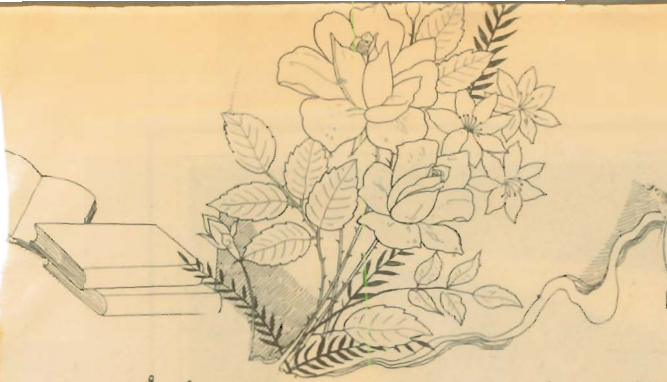

آخری بات

حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت میں اسلامی سلطنت بے حد وسیع ہوئی۔ مُسلمان مجاہدوں کے بڑھتے ہوئے قدم، ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں اور نعرہ تکبیر سے جنگ کے میدان و ایوان لرز اُٹھے۔ مُسلمان مجاہد جہاں جہاں پہنچے اپنی شرافت، اعلیٰ اخلاق، جرأت اور عُمدہ کردار کی لازوال داستانیں رقم کر گئے۔

ایک ایسے ہی جانباز، اور بلند کردار ابو عبید ثقفیؒ سالارِ اسلام کا واقعہ آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں اگرچہ انہیں آنحضرتؐ کی صحبت کا شرف حاصل نہ تھا۔ (یعنی صحابی نہ تھے) لیکن اپنی دلیری اور جرأت کی وجہ سے مشہور تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے عراق کے لئے جو مہم روانہ کی ان میں سے ایک بڑی مہم کی ذمہ داری ابو عبید ثقفیؒ کے سپرد کی گئی۔ حضرت ابو عبیدؒ ثقفی اس مہم میں بڑی بہادری سے لڑے اور جرأت و بے خوفی کی متعدد مثالیں قائم کیں۔ حیرۃ، نمازق، کسکر اور سقاطیہ مُسلمانوں کے قبضے میں آگئے تھے۔ فرخ اور فراونداد جو بارد سما اور زوابی کے رئیس تھے، مطیع ہو گئے چنانچہ اظہارِ خلوص کے لئے ایک دن ابو عبید ثقفیؒ کو نہایت عُمدہ عُمدہ کھانے پکوا کر بھیجے۔ ابو عبیدؒ نے دریافت کیا۔

"یہ سامان کُل فوج کے لئے ہے یا صرف میرے لئے"

فرخ نے کہا۔ "جلدی میں ساری فوج کے لئے اہتمام نہ ہو سکا یہ تو آپ کے لئے ہے۔"

ابو عبید ثقفیؒ نے دعوت قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا۔ "میرے ساتھی معمولی کھانا کھائیں اور میں عُمدہ کھانا یہ خوشی مجھے گوارہ نہیں۔ مُسلمانوں میں ایک کو دوسرے پر کچھ ترجیح نہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو خوش رکھوں گا تو اللہ بھی خوش رہے گا!!"

IMPORTED

QUICE
QUICE Lemon Lime
2 GREAT CANS

2 EXCITINGWAYS TO COOL DOWN & FRESHEN UP !

Quice Food Industries Ltd.

REGD. No. SS-246 JUNE 1996
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

مزہ ہے یہی سب سے اچھا!

Sparkling
Vimto

پاکستان میں
پہلی مرتبہ
1 لیٹر NR
گلاس بوتل میں

240 ملی لیٹر
NR بوتل
میں بھی۔